DELHI UNIVERSITY LIBRARY

Cl. No. O168,3;N1CA,12 N41 EPU

Ac. No. E1865

Date of release for loan 4.12.64

This book should be returned on or before the date last stamped below. An overdue charge of 0.6 nP. will be charged for each day the book is kept overtime.

DELHI UNIVERSITY
LIBRARY

چنتا

پسواشر کی روشیں

میرزا عظیم بیگ چغتائی

(جملہ حقوق محفوظ)

سِوانہ کی رُوپین

سرزمین مارواڑ کی ایک انتہائے زیادہ المناک اور غمناک ٹریجڈی
کے پُر اسرار حالات

یعنی

راٹھوروں کی خانگی باتیں! راجپوت کماریوں کی جرأت کے کارنامے اُن کے حسن و جمال کی رعنائیاں اور فسونِ محبت کی دلکش سحر کاریاں۔ رزم بزم کی ہوشربا داستان جگر پاش اور جانگسل واقعات۔ حسن و عشق کی رنگین داستان۔ ایک خوفناک اور دل ہلا دینے والی دلدوز ٹریجڈی۔ ایک ظرافت نگار کے قلم سے

مصنفہ
مرزا عظیم بیگ چغتائی بی اے ایل ایل بی (علیگ)

ملنے کا پتہ نظامی بک ایجنسی بدایوں (یو۔پی)
(مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

پیش لفظ

"سوانہ کی روحیں" چغتائی صاحب کا بے مثل شہ پارہ ہے ستمبر ۳۵ء میں لیمن گن سے
ملنے جودھپور گیا تھا جہاں کی تواضع انہوں نے اس طرح کی کہ پے در پے کئی مضمون ساقی کیلئے
لکھ ڈالے۔ مجھے روکنے کی انہیں یہ انوکھی ترکیب سوجھی کہ رات کو کسی کہانی کا پلاٹ سُناتے
اور پھر کہتے کہ ایک دن اور رک جاؤ تو یہ کہانی اور لکھائیں۔ غرض میرے ایک ہفتہ کے
دوران قیام ہی میں انہوں نے دس بارہ نہایت عمدہ افسانے مجھے لکھ کر دیئے۔ یہیں سے مجھے
"چغتائی نمبر" کی اشاعت کا خیال آیا جو چند اور مضامین کے اضافہ کے ساتھ یکم اکتوبر ۳۵ء
کو شائع ہوا۔ "سوانہ کی روحیں" چغتائی صاحب کے تخیلی مضامین کا سب سے اچھا نمونہ ہے
دوسری بات یہ دیکھنے کی ہے کہ چغتائی صاحب مشہور ظرافت نگار تھے لیکن جب ٹریجڈی
لکھتے تھے تو اتنی موثر کہ آنسو رک نہیں سکتے تھے "سوانہ کی روحیں" مرزا صاحب کی حزن
نگاری کا شاہکار ہے۔ کہانی اتنی دلکش ہے کہ غالباً ان کی کوئی کہانی اتنی دلکش
نہیں۔ مارواڑ کے رزم و بزم کے واقعات اور ان کی حسین تصویر کشی کے لحاظ
سے یہ چھوٹی سی کتاب اپنی نوعیت کی پہلی چیز ہے اور غالباً آخری بھی۔ کہ اب سرزمین
مارواڑ کو چغتائی جیسا سپوت میسر نہیں آسکتا۔

دلی مورخہ ۱۵ نومبر ۴۱ء — شاہد احمد

زندہ بنگار راٹھور

راٹھوڑی کھانڈے کے نام

ع

صدیوں تک جس نے گورگانی تیغہ کا ہاتھ بٹایا ہے!

بصد احترام و عقیدت

عقیدت کیش

عظیم بیگ چغتائی

"چغتائی منزل" جودھپور

۲۴ راگست ۱۹۳۵ء

سوانہ کی روحیں

سوانہ[1] کی پُراسرار پہاڑیوں کے خوفناک غاروں اور بلند چوٹیوں کے نشیب و فراز میں اکثر لوگوں کو سفید بلیاں دکھائی دیتی ہیں جو عموماً کسی ناخوشگوار سانحہ کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اور وہاں گھومتا ہوا کوئی اگر ان کو دیکھ لیتا ہے تو سہم کر بھاگ جاتا ہے۔ مگر اجنبی ان کی طرف غور سے دیکھتا ہے اور اس کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ انکی طرف دیکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ جانتا بھی نہیں کہ وہ ان کے پیچھے خود نہیں جاتا بلکہ جانے پر مجبور ہے۔ اتفاقاً میں نے بھی ایسی ہی ایک بلی دیکھی لیکن ربّ سبحانہ، تو وہ بلائے بد بخیر گزشت۔ سنئے اور بہت سے چھوٹے :۔

---

[1] ریاست جودھپور کا مشہور قصبہ جس کی گپھاؤں میں درگا داس راٹھور نے اورنگزیب کے پوتے پوتی کو چھپا دیا تھا اور چودہ برس تک وہیں پرورش کی۔

زنڑبنکار راٹھوڑ

راٹھوڑی کھانڈے کے نام

ع

صدیوں تک جس نے گورگانی تیغہ کا ہاتھ بٹایا ہے!

بصد احترام و عقیدت

عقیدت کیش

عظیم بیگ چغتائی

"چغتائی منزل" جودھپور

۲۴ اگست ۱۹۳۵ء

سِوآنہ کی رُوحیں

سِوانہ[1] کی پُراسرار پہاڑیوں کے خوفناک غاروں اور بلند چوٹیوں کے نشیب و فراز میں اکثر لوگوں کو سفید بلیاں دکھائی دیتی ہیں جو عموماً کسی ناخوشگوار سانحہ کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اور وہاں گھومتا ہوا کوئی اگر ان کو دیکھ لیتا ہے تو سہم کر بھاگ جاتا ہے۔ مگر اجنبی ان کی طرف غور سے دیکھتا ہے اور اُس کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ انکی طرف دیکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ جانتا بھی نہیں کہ وہ ان کے پیچھے خود نہیں جاتا بلکہ جانے پر مجبور ہے۔ اتفاقاً میں نے بھی ایسی ہی ایک بلی دیکھی لیکن ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔ سستے اور بہت سستے چھوٹے ۔

---

[1] ریاست جودھ پور کا مشہور قصبہ جس کی گپھاؤں میں درگ ایس اٹھور نے اورنگ زیب کے پوتہ پوتی کو چھپا دیا تھا اور چودہ برس تک وہیں پرورش کی ۔

(۱)

اسی مہینے کی ۹ تاریخ کا ذکر ہے کہ میں ایک کام سے سوانہ گیا۔ کام سے فراغت حاصل کر کے سوانہ کے مشہور قلعہ کی طرف گیا۔ قلعہ کی پشت کی طرف پہاڑی کے دامن میں دور تک چلا گیا۔ سرخ رنگ کی خاموش اور ہیبت ناک چٹانوں کا ایک عظیم الشان سلسلہ ہے جو دور تک چلا گیا ہے اور قلعہ کے ارد گرد میلوں تک زمانہ ماضی کی فوجی اور شاہی عمارتوں کے کھنڈر چلے گئے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں علاؤالدین خلجی کی فوجیں راجپوتوں سے ٹکرائی تھیں اور یہاں قلعہ کے آس پاس نہ معلوم کس کس زمانہ میں کیسے کیسے قلعہ اور محل تھے۔

یہ پہاڑیاں بھی عجیب وغریب ہیں۔ ان کی عجیب وغریب وہیبتناک اور تاریک سرنگوں اور گپھاؤں کے طرح طرح کے افسانے مشہور ہیں۔ وسیع دہانہ کی ایک سرنگ میں آپ اگر داخل ہوں تو دو تین فرلانگ تک سیدھے چلے جائیے پھر کہیں ایک عظیم الشان ہال ملے گا۔ جس کو قدرت کے ہاتھوں نے پہاڑی کے اندر ہی کاٹ کر بنایا ہے اور زمانہ قدیم کے رہنے والوں نے اپنے بھدے اوزاروں سے اس ہال کو اپنی رہائش کیلئے ٹھیک کیا ہے۔ کسی نکلی ہوئی چٹان کو تراش کر تخت کا کام لیا ہے تو دیوار کے کسی گڑھے کو برابر کر کے الماری یا طاق کا کام لیا ہے۔ اب اس ہال میں دیکھئے

تو چار پانچ سرنگوں کے دہانے ہیں جو علیحدہ علیحدہ سمت میں چلے گئے ہیں۔ ان میں سے کسی میں جایئے، آگے چل کر آپ کو پھر طرح طرح کے ہال یا کمرے اسی طرح کے ملیں گے۔ ان میں سے بعض میں آپ دیکھیں گے کہ حوض بنا ہے جو پانی سے لبریز ہے۔ یہ پانی اپنے قدیمی راستے سے بارش کے زمانے میں پہاڑ کی چوٹی سے رس کر آجاتا ہے پانی زیادہ ہو تو حوض بہہ نکلتا ہے۔ بس۔ بارش زدا نہ۔ پانی خشک ہو جاتا ہے پھر اس ہال میں سے بھی اِدھر اُدھر راستے چلیں گے۔ کوئی راستہ کسی تاریک اور خوفناک کھڈ میں جا کر ختم ہو گیا اور کوئی راستہ اس قدر چھوٹا ہو گیا ہے کہ اس میں سے جانے کی ہمت نہیں پڑتی لیکن بہت سے راستے ایسے ہیں کہ ان میں گھوڑا دوڑائے چلے جایئے۔ اور بعض جگہ پہاڑی کے مشرق سے داخل ہو کر مغرب کی طرف نکل جایئے۔ یہ تمام سرنگیں قدرتی ہیں۔ صرف کہیں کہیں انسان کے کاریگر ہاتھ نے ان کو درست کر لیا تھا۔

میں ٹہلتا ٹہلتا دور تک چلا گیا۔ کوئی ڈیڑھ میل پر جا کر مجھے عمارت کا ٹوٹا ہوا حصہ بلندی پر نظر پڑا۔ ایسا کہ میرا جی چاہا کہ دیکھوں تو کہ اس شکستہ دیوار کے اس طرف کیا ہے۔

بڑے بڑے پتھروں اور چٹانوں میں ہوتا ہوا میں اوپر چلا گیا۔ کوئی آدھی دور گیا ہوں گا کہ ایک عجیب وغریب معاملہ پیش آیا۔ ایسا کہ میں عمر بھر

کبھی نہیں بھولوں گا۔

جاتے ہیں داہنے ہاتھ کو ایک طرف ایک ٹھوٹھر کا سخت جان درخت تھا۔ اُس کے پاس ہی ایک سفید رنگ کی بلی کھڑی تھی اور جیسے ہی میں پہونچا ہوں کہ وہ بولی۔ میں نے معاً اس کی طرف دیکھا کہ ایسی بلی بھلا یہاں کہاں سے آئی! میرا دیکھنا تھا کہ وہ آہستہ سے مڑ کر چلی۔ نہ معلوم کیوں میں بھی اُس طرف بڑھا۔ یہ دیکھنے کو کہ کدھر جاتی ہے۔ ایک چٹان کا ستون کا ستون کھڑا تھا جس میں کوئی دو فٹ کی کگر نکلی ہوئی تھی۔ بلی اس پر گئی۔ پاس ہی تھا لہٰذا میں بھی اُس کگر پر ہو کر دوسری طرف گھوم کر نکلا تو شکستہ چٹانوں کی ایک تنگ گلی سی ملی جو آگے ہی جا کر ختم ہوتی معلوم دی۔ بلی اس میں گئی تو میں بھی دس قدم بڑھا ہوں گا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ بلی ایک چھوٹے سے غار میں گھس گئی۔ سامنے ہی غار تھا اور میں نے جو آگے بڑھ کر اُس میں جھانک کر دیکھا ہے تو۔ الامان!

تاریکی میں ایک جُنبش سی نظر آئی اور ایک انتہا سے زیادہ ضعیف آواز تاریکی کے خوفناک پردوں سے لرزتی سی نکلی۔ ایسی کہ میرے بدن کے رونگٹے

کھڑے ہو گئے۔ "جے شری ماتاری"۔ راجپوتی سلام تھا۔ یہاں عادت ہے کہ راجپوتوں سے بسا اوقات یہ بھی سلام ہو جاتا ہے۔ میری زبان سے بھی جواب نکلا "جے شری ماتاری"۔ اور غور سے دیکھتا ہوں تو ایک عجیب و غریب ہستی اس مختصر غار میں دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھی ہے۔

گندمی رنگ کا برہنہ بدن جو سب کا سب سفید۔ رنگ کے میلے جھاڑ جھنکاڑ سے بالوں میں اُلجھا سا پڑا تھا۔ چہرہ کا پتہ لگنا مشکل۔ بالوں کی اُلجھی ہوئی لٹوں کے درمیان سے دو آنکھیں چمک رہی تھیں جن میں سے ایک کا آدھا حصہ بھنوؤں اور سر کے پریشان بالوں سے چھپا ہوا تھا۔

(۲)

میں غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اُس نے اپنا لکڑی کی طرح خشک اور سوکھا ہوا مُردہ ہاتھ اُٹھایا اور مجھے آنے کو اشارہ کیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کوئی عبادت گزار سادھو ہے اور بہتر ہے اس کی قدمبوسی حاصل کی جائے۔ اور بلاتا بھی ہے۔ لہٰذا میں جھک کر غار میں داخل ہوا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر جس طرح مارواڑی بزرگوں کو سلام کیا جاتا ہے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ اُس نے محبت سے سر کو جنبش دی اور قریب بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا۔ میں نے غور سے اس

سادھو کو دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ میں دراصل اس کے بالوں کو دیکھ کر حیرت میں تھا ایک جنگل تھا کہ سر سے جٹائیں کی جٹائیں لٹکی ہوئی دُور تک زمین پر پھیلی ہوئی تھیں اور اُن کو سیمنٹ کردہ اُن سے ستر پوشی کا کام بھی لے سکتا تھا۔

سادھو نے صاف بیشتر بتیار لہجے میں مارواڑی میں مجھ سے باتیں شروع کیں اور میرے لئے حیرت و استعجاب کا باب کھول دیا اُس نے مجھ سے کہا:۔

”میں تمہارا ابھی ممنون ہوں گا اگر تم ایک لاش کا کریا کرم کرنے میں مدد دے سکو۔“

میں نے گھبرا کر کہا کس کی لاش؟“

”ایک غم نصیب ہستی کی۔“

میں نے سادھو کی طرف دیکھا۔ دراصل میں کسی طرح بھی کسی لاشے سے سروکار نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بجائے ہاں۔ ہوں کرنے کے میں نے کہا:۔

”آپ یہاں اکیلے ہیں؟“

”ہاں میں اکیلا ہوں۔“

”کب سے؟“

سُوکھے مُنہ سے بُڈھے نے کہا: "بہت دن ہوئے۔ اب کون سمت ہے؟ یہ سمت ۱۸۱۵ کا ذکر ہے جب میں یہاں آیا تھا۔"

"سمت ۱۸۱۵!" میں نے حواس باختہ ہو کر کہا۔ اور یہ سمجھا کہ ضرور اس کی عقل خراب ہو گئی ہے۔ "سمت ۱۸۱۵ میں آپ یہاں آئے تھے! پونے دو سو برس پہلے! اب تو سمت ۱۹۹۲ ہے۔"

سادھو نے کہا "ہاں سمت ۱۸۱۵ کی چیت بدی چھٹ کو میں نے یہاں آسن جمایا تھا۔ میرا جنم سمت ۱۷۹۱ کا ہے اور اس وقت میں تیئس ۲۳ برس کا ہوں گا۔"

میں بھاگنے کی تمہید اپنے دل میں اٹھا رہا تھا۔ میں نے پھر ہی سوال کیا۔

"آپ کون ہیں؟"

"میں سادھو ہوں اب تو۔"

"اب تو........."

ہاں اب تو سادھو ہوں۔ پہلے کچھ اور تھا جوانی میں۔"

"کیا تھے؟"

"سپاہی۔"

"پھر سادھو کیسے ہو گئے؟"

سادھو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری ایسی کہ اس کی سب کی سب پسلیاں چمکنے لگیں اور اس نے مجھ سے کہا:-

"کیا کرو گے پوچھ کے؟ مگر یہی بہتر ہے کہ میں تمہیں بتا دوں بلکہ شاید ضروری ہے مگر یہ بتاؤ تمہیں تھوڑی بہت اس وقت فرصت ہے؟"

میں نے کہا: "مہاراج آپ ضرور سنائیے۔ اور یہ بھی بتائیے کہ اب تک آپ زندہ کیسے ہیں؟"

سادھو نے متعجب ہو کر کہا: "زندہ! زندہ ہوں میں! اوہو۔ اب تم ذرا اطمینان سے بیٹھو اور سنو۔ سب معلوم ہو جائے گا کہ میں اب تک کیسے زندہ ہوں" سادھو نے اپنا قصہ صاف مارواڑی میٹھ ستہ لہجہ میں شروع کیا۔ جس کا مطلب یا ترجمہ حسب ذیل ہر جو پیش کرتا ہوں۔

بائی شری جاڑیچی جی[1]

میرا نام میٹر بنا امر سنگھ ہے۔ میرا باپ راگھوجی سوجت[2] کے قلعدار دلیپ سنگھ جاڑیچہ کی نوکری میں تھا۔ دلیپ سنگھ کی اور میرے باپ کی پرانی دوستی تھی بلکہ بھائی چارہ تھا اور دونوں پگڑی بدل بھائی تھے۔ میرا باپ غریب تھا مگر دلیپ سنگھ جاگیردار اور قلعدار تھا۔

سوجت کے قلعے کے پشت کی پہاڑیوں میں ایک بلند چوٹی پر دلیپ سنگھ کا محل ہے۔ دلیپ سنگھ کے بیوی بچے اسی محل میں رہتے تھے۔ محل بھی ایک اچھا خاصہ قلعہ ہے۔ تم نے دیکھا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہاں سوجت کا عظیم الشان قلعہ کہنہ میں چل گیا۔ میں سوجت

---

[1] جاڑیچہ راجپوتوں کی مشہور ذات ہے۔ ہر جاڑیچہ کی لڑکی جاڑیچی جی کہلاتی ہے۔ مشہور کرکٹ کھلاڑی رنجی نادان نگر کے راجہ جاڑیچہ تھے۔

[2] ریاست جودھپور کا قصبہ ہے جو بی بی سی آئی ریلوے پر سوجت روڈ کا اسٹیشن ہے۔ یہ قلعہ جس کا ذکر ہے اجمیر والی سڑک کے کنارے ہی ہے۔

میں بہت رہا ہوں اور قلعہ میں کھیتی ہوتی ہے محلوں اور کھنڈروں میں گیا ڑوں کا شہر آباد رہے اس کی پشت پر بھی مجھے تو کھنڈر ہی کھنڈر نظر آتے ہیں۔ ہاں قلعہ کے قریب شری چوانڈا جی[1] کا استھان البتہ قائم ہے۔"

سادھو نے شری چوانڈا جی کے نام پر دونوں ہاتھ جوڑ کر احترام سے اُٹھائے اور پھر مجھ سے پوچھا:۔

"تم نے اُن کے درشن کئے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں میں تو صبح کو دوسرے تیسرے روز جاتا تھا اُدھر تب درشن بھی کرتا تھا۔"

سادھو نے کہا۔ "افسوس۔ رہے نام مالک کا۔ ہاں اسی محل کا ذکر کر رہا ہوں جس کو تم بتلاتے ہو کہ صفحۂ ہستی سے مٹ گیا میں اسی محل میں پڑھا اور پلا اور جوان ہوا ہوں۔ جس کے خوف زدہ کھنڈروں کو دیکھ کر تم وحشت زدہ ہو گئے ہو۔ ذرا مجھے تفصیل کے ساتھ بتاؤ کہ اُس گہوارۂ عشرت کا اب کیا حال ہے۔"

میں نے تفصیل کے ساتھ سوجت کے قلعہ اور اس کے گرد و نواح کے تمام

---

[1] راٹھوروں کی خاص خاندانی دیبی۔

کھنڈروں کا سارا حال بتایا جس کی تفصیل کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ اُس نے میری آنکھوں کے سامنے محلوں کی تصویر کھینچ دی اور میں نے اس جھلکتی تصویر کو بگاڑ کر موجودہ کھنڈروں کی تصویر پیش کر دی جہاں تک عبرت کا سوال ہے، ہم دونوں نے عبرت حاصل کی۔ اُس نے کم میں نے زیادہ۔ اس کے جملۂ معترضہ کے بعد میں پھر سادھو کے قصہ کو لیتا ہوں۔

سادھو نے اپنا قصہ پھر شروع کیا:۔

"....... دلیپ سنگھ جی رات کو سوجت کے قلعہ میں رہتے تھے اور صرف دن کو اپنے محل میں تھوڑی دیر کے لئے آتے تھے۔

دلیپ سنگھ کی ٹھکرانی ہاڈی[۱] جی تھیں۔ میں نے سوجت ہی میں ہوش سنبھالا میرے پتا جی محل کی ڈیوڑی کے سردار اور محل کے مختار کُل تھے۔ ٹھاکر دلیپ سنگھ کے سوائے ایک لڑکی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اس لڑکی کا نام پھول کنور تھا اور محل میں سب اُس کو "سندری بائی جی" بھی کہتے تھے۔ میں بھی چونکہ ایک نوکر کا لڑکا تھا لہٰذا میں بھی اُن کو بائی جی کہتا تھا۔

---

[۱] راجپوتوں کی قوم ہاڈا۔

بائی شری جاریجی چھوٹی عمر سے میرے ساتھ ہی کھیلی ہوئی تھیں۔ ان کو گھوڑے کی سواری سے بہت شوق تھا اور محل میں ان کے لئے گھوڑے دوڑانے کا میدان بنوا دیا گیا۔ ابھی دس بارہ برس ہی کی عمر تھی کہ نوعمر بائی شری جاریجی جی سپاہیوں کی طرح نیزہ بازی کرنے لگیں۔

بائی جی عمر میں مجھ سے چھ یا سات سال چھوٹی تھیں۔ جب وہ بارہ برس کی ہوئیں تو میں اٹھارہ برس کا ہوا اور اب میں اُن کے ساتھ نہیں کھیلتا تھا اب خدا کی شان کہیئے یا بدقسمتی یہی وہ زمانہ تھا کہ نوعمر بائی جی میرے خیالوں میں بس کر رہ گئیں بھلا غور تو کیجئے کہ کہاں ایک معزز ٹھاکر کی خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی اور کہاں میں۔

بائی جی مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں علاوہ اس کے یہ بھی میں جانتا تھا کہ وہ میرا خاص خیال کرتی تھیں مجھے سب لوگ امر کہتے تھے اور بائی جی کبھی پکارتیں تو امر جی کہہ کر پکارتیں۔ میں اُن کو ہمیشہ نہایت ہی ادب سے جھک کر دونوں ہاتھوں سے تعظیم دیتا تھا اور میں دیکھتا تھا کہ وہ میرے مودبانہ دستور کو پسند کرتی تھیں۔

وقت گزرتا گیا اور بائی جی کی دلکش تصویر کا نقش میرے دل پر اور بھی

گہرا ہوتا گیا حتیٰ کہ یہ سچ مچ وہ آنکھوں اور دل میں بس گئیں مگر اُن کو مطلق علم نہ ہو سکا کہ میں اُن کے عشق میں مبتلا ہوں۔

(۲)

بائی جی کو تیرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ چوانڈا جی کے درشن کو تو اکثر جاتی تھیں لیکن کبھی کبھی چوانڈا جی کے استھان کے نیچے جو پختہ جھیل ہے اُس میں اشنان بھی کرتی تھیں۔ چاروں طرف پہرہ لگا دیا جاتا تھا اور محل کی دو چار عورتیں اور ڈاوڑیاں (خواصیں) ساتھ ہوتی تھیں۔ اس موقع پر بائی جی اپنے تیرنے کے شوق کو پورا کرتی تھیں۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ صبح کوئی دو گھڑی دن ڈھلا ہوگا کہ سوجت کے قلعہ سے محل کی طرف روانہ ہوا۔ خیال آیا کہ لاؤ چوانڈا جی کے درشن کرتا چلوں۔ لہذا پہاڑی پر سے جو راستہ چوانڈا جی کو جاتا تھا اُس کی طرف چلا۔ اصل راستہ آپکو معلوم ہی ہوگا کہ جھیل کی طرف سے ہے۔ لیکن میں نے یہ سوچا کہ چکر کاٹ کر اُدھر کون جائے۔ لاؤ اسی طرف سے پہاڑی پر چڑھ جاؤں۔ چنانچہ تم نے دیکھا ہوگا راستہ نہ صرف ناہموار ہے بلکہ بعض جگہ بہت دشوار گذار ہے۔ لیکن میں جوان تھا مزے میں چڑھتا چلا گیا۔ استھان پر پہونچکر میں نے چوانڈا جی کے درشن کئے اور واپس

اصلی راستے سے جانے لگا تو مجھے ایک چارن نے روکا اور کہا کہ اُدھر مت جاؤ۔ بائی جی اَشنان کر رہی ہیں اور پہرہ لگا ہوا ہے۔ تم کدھر سے چڑھ آئے ہو؟ اسکے مُنہ سے یہ لفظ مشکل ادا ہوئے تھے کہ جھیل کی طرف سے عورتوں کے چیخنے چلّانے کا شور برپا ہوا۔ بائی تمری جا ایکجا جی ڈوب رہی تھیں اور تمام عورتیں چیخ رہی تھیں۔ "بائی جی ڈوب رہے ہے۔ بائی جی ڈوبے ہے!" کسی کے ڈوبنے کی خبر سن کر ویسے ہی ہوش خطا ہو جاتے ہیں اور بالخصوص میرے لئے یہ خبر پیغامِ موت سے بدتر تھی۔ لہذا بدحواس ہو کر میں راستے کی طرف دوڑا مگر تھوڑی ہی دور جانے پایا تھا کہ مجھے پہرے کے سپاہی نے روک دیا اور باوجود میری کوشش کے اُس نے جانے نہ دیا۔ مجبوراً میں پھر پلٹا اور اوپر آ کر استھان کی دیوار پر چڑھ گیا اور دیوار سے کود پڑا۔ دیوار چار یا پانچ گز اونچی تھی۔ اور یہاں سے بالکل ناہموار ڈھال پر سے پتھروں میں سے ہوتا ہوا سامنے چٹان پر پہونچا اور یہاں سے جو نظارہ میں نے دیکھا اُس نے مجھے پاگل کر دیا۔ بائی جی واقعی ڈوب رہی تھی اور کنارے کی عورتوں کی رسائی سے بہت دُور تھی میں دیوانہ وار اِس چٹان پر سے آگے بڑھ کر نیچے والی چٹان پر پہونچا۔ یہاں تم نے دیکھا ہوگا دُور تک کھُلا ہوا راستہ چلا گیا ہے۔ پہاڑی کے سہارے سہارے اِس راستے پر میں دوڑا

چلا گیا اور تیزی سے میں اُس جگہ پر پہونچ گیا جو ایسی تھی کہ جس پر سے کُود کر میں جھیل میں گر سکتا تھا۔ چنانچہ عورتوں کے بے ہنگام شور و غل میں ہمت کر کے میں نے ایک جست لگائی اور کوئی پچیس گز کی بلندی پر سے سیدھا جھیل میں کود پڑا۔ گرنے کے زور میں نیچے تک ڈوبتا چلا گیا لیکن پھر مجھے پانی نے اوپر پھینکا تو میں نے دیکھا کہ فاصلہ پر بائی جی پانی سے آخری زور آزمائی کر رہی ہیں اور امداد کے لیے چیخ رہی ہیں۔ میرے جھیل میں گرنے سے عورتوں کا شور و غل ایکدم سے بند ہو گیا تھا اور میں نے وہیں سے آواز دی۔ "بائی جی گھبرانا مت میں آتا ہوں" اور یہ کہتے ہوئے جس قدر بھی مجھ سے تیزی سے ہو سکا پانی کو چیرتا ہوا بائی جی کے پاس پہونچا۔ بائی جی کا بُرا حال تھا اور اُن پر سخت وحشت طاری تھی۔ میرے پہونچتے ہی وہ مجھ سے بُری طرح چمٹ گئیں۔ ایسی کہ مجھے بڑا لحاظ معلوم دیا کیونکہ اُن کا لباس ضرورت سے زیادہ غیر ساتر تھا۔ میں نے بائی جی کو بائیں ہاتھ سے اپنی گود میں سنبھالا اور اُنہوں نے میری گردن میں چمٹ کر اپنا ہاتھ حائل کر دیا۔ اور ایک ہاتھ اور پاؤں سے میں پانی کاٹ کر کنارے پر پہونچا اور بائی جی کو اُنکی ڈاوڑھیوں کے سپرد کر کے جھیل میں پانی آنے کی پختہ موریوں میں سے گھس گیا اور جا کر قلعہ کی موریوں کے پاس نکلا۔ یہاں پہونچکر میں نے اپنے کپڑے نچوڑے

اور محل میں چلا آیا۔ بائی جی کو جس وقت میں پانی میں سے چیرتا ہوا لا رہا تھا اُس وقت میں نے اُن کے ساتھ ایک گستاخی بھی کی تھی یعنی اُن کے رُخسار کو چوم لیا تھا۔ یہ خطا مجھ سے ایک بے بسی کے عالم میں سرزد ہوگئی تھی۔ لیکن بائی جی نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ بُرا بھی نہ مانیں بلکہ شرما کر اپنا رُخسار میری گردن میں چھپا لیا۔ لیکن دفعتاً مجھے احساس ہوا تو میں نے لجاجت کے ساتھ ـــــ اُن سے معافی مانگی اور کہا "اگر آپ کو بُرا معلوم ہوا ہو اور آپ اس گستاخی کو معاف نہ کر سکتی ہوں تو میں یہ بہتر سمجھوں گا کہ آپ کو کنارے پر پہونچا کر بطور سزا اِسی پانی میں ڈوب مروں"۔ بائی جی نے مُنہ سے تو اِس کا جواب کچھ نہ دیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اُن کی آنکھوں نے نہ صرف مجھ سے یہ کہہ دیا کہ ایک سرے سے اوّل تو یہ کوئی خطا ہی نہ تھی اور تھی بھی تو میری نہ کہ تیری!! اور جب میں نے اُنہیں کنارے پر پہونچایا ہے تو پھر اُن کی آنکھوں نے اِسی بات کی دوبارہ تصدیق کی اور وہ بھی اِس پیرائے میں کہ مجھے معلوم ہوا کہ خطا کا سوال ہی نہ تھا۔

(۳)

قِصّہ کو اِس طرح مختصر کرتا ہوں کہ کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور طرفین یعنی میں اور بائی جی ایک دوسرے کے ہوکر رہ گئے۔

میں چونکہ محل ہی میں رہتا تھا اور مجھ سے پردہ بھی نہ تھا لہٰذا عشق کی کہانیاں اور بھی جلد مرتب ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ کہ بائی جی خود میری محبت میں چور ہو کر رہ گئیں۔ عورت کی محبت نہ صرف ایک دولت ہے بلکہ ایک ایسی نعمت ہے اور ایک ایسی پرفسوں چیز ہے جس میں نہ صرف رنگینی بلکہ زبردست قوت کا احساس آدمی کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ مگر یہاں یہ حال تھا کہ میں ایک ادنیٰ چاکر اور وہ ایک زبردست قلعہ دار اور جاگیردار کی چہیتی بیٹی۔ چنانچہ ان امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ ضرور کسی نہ کسی دن یہ رنگین محبت برے دن دکھائیگی۔

جالور[1] کے قلعدار کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس کا نام دلاور سنگھ تھا۔ یہ ایک بڑا منچلا اور شیر دل جوان تھا عموماً لوگ اس کو "دل جی کونباوت[2]" کے نام سے پکارتے تھے۔ جب شیر بائی جی کی عمر چودہ پندرہ برس کی ہوئی۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ میں ان کی اور وہ میری محبت میں فنا ہو رہے تھے کہ بائی جی کے والد بیمار پڑ گئے۔ بچنے کی جب کوئی آس نہ رہی تو انھوں نے یہ وصیت کی کہ میرا

---

[1] جودھپور کا قلعہ اور قصبہ ہے قلعہ نہایت مستحکم ہے یہاں علاؤالدین خلجی نے زور آزمائی کی تھی۔
[2] راٹھور بنس جوکہ نباجی کی اولاد ہیں ہیں کونباجی کہ جودھا جی کے بھائی تھے جنہوں نے جودھپور بسایا۔

قلعہ یعنی محل مع آس پاس کی زمین کے دل جی کو بناوت کو دیدیا جائے اور میری لڑکی بھی اسی کو بیاہ دی جائے۔ چنانچہ اس بارے میں انہوں نے دل جی کے باپ کو ایک خط بھی لکھ دیا جو اُن کا پُرانا دوست تھا۔ بائی جی کے والد کا وصیت کے بیت رہ دن کے اندر ہی اندر انتقال ہوگیا۔ اُن کے صرف ایک ہی ٹھکرانی ہاڈی جی تھیں جو اُن کی چتا میں بیٹھ کر ستی ہوگئیں۔ اب صرف بائی جی رہ گئیں اور جالور والوں نے آن کر قلعہ کی کنجیاں اپنی تحویل میں لے لیں اور سوگ ختم ہونے کے جالور والوں نے شری بائی جی سے شادی کی تمہید اُٹھائی۔

میرے لئے یہ وقت انتہا سے زیادہ سخت تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں چپکے سے رات کے وقت ایک ایسی جگہ جا پہونچا جہاں بائی جی مجھے اکیلی مل گئیں۔ اور میں نے حال دل اُسنا کر فریاد کی تو انہوں نے کہا کہ "میں عورت ہوں تم مرد ہو بہ نسبت تمہارے میں زیادہ مجبور ہوں"۔ میں یہ سُن کر اور اُن کو اپنی محبت میں متزلزل سمجھ کر واپس چلا آیا۔ لیکن نہیں میرا خیال غلط تھا دوسرے ہی دن محل میں ایک تہلکہ سا بپا ہوگیا۔ یہ واقعہ تھا کہ بائی جی نے کو بناوت سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس قصے نے ایسا طول کھینچا کہ سارا محل زیر و زبر ہوگیا۔ بائی جی کا کہنا تھا کہ "میں کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ میں تو شنکر کے تال پر جا کر فقیری

لے لوں گی"۔ لاکھ عورتوں نے سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانی اور اس دوران میں کہ بناوتوں نے جو یہ خبر سنی تو جانور سے ایک دستہ لیکر سیدھے محل کی طرف دوڑ پڑے اور قلعہ کے ہر شعبہ اور محکمہ پر قبضہ کر کے بائی جی کے رنگ محل کے ارد گرد گھیرا ڈال دیا۔ مطلب یہ کہ یوں راضی خوشی نہیں تو زبردستی شادی کر لیں گے۔

چنانچہ خود نوجوان کو بناوت بھی آگیا۔ اور باہر اس نے ڈیرے ڈال دیئے اور اس کے بعد کو بناوتوں نے محل کی تمام بارسوخ عورتوں کو اپنی طرف ملا کر بائی جی پر جائز و ناجائز دباؤ ڈال کر ان کو اپنے باپ کی وصیت پر عمل کی ترغیب دلانی شروع کی۔ مجھے کو بناوتوں سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ علاوہ رقیبوں نے کے کہ بناوت نے سب سے پہلے میرے باپ ہی کو نکالا تھا۔ چنانچہ میرے والد تو کادل چلے گئے لیکن میں نہ گیا اور جا بھی کیسے سکتا تھا۔ بڑی سخت کشمکش اور رد و قدح کے بعد بائی جی کو چھ ماہ کی مہلت ملی تھی کہ اس دوران میں جو کچھ بھی سوچ بچار کرنا ہے سوچ سمجھ لیں۔ اور اس مہلت ملنے کے بعد ہی سوجت چھوڑ کر میں اپنے گاؤں آیا تھا اور اس فکر میں تھا کہ یا مدد دوستوں کو جمع کر کے کسی طرح سوجت لے چلوں اور جس طرح بن پڑے بائی جی کو نکال لاؤں۔ لیکن مجھے گھر آئے ہوئے کوئی بیس پچیس دن ہوئے ہوں گے کہ میں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔

["کیا دیکھتا ہوں کہ بائی شری جاڑیچہ جی سولہ سنگار کئے بال بال موتی پروئے
حُسن و عشق کی مجسّم تصویر بنے رنگ محل کی سیڑھیوں پر کھڑی ہیں۔ اور داہنا ہاتھ اُن
کا اُن کے سامنے۔ اُنگلی اٹھی ہوئی مشعل کی طرح جل رہی ہے جس کی تیز روشنی کا نور
اُن کے سُرخ و سفید چہرے پر ایک عجیب انداز سے پرتو فگن ہے۔ ایسا کہ میں اُن کے
حُسن لاثانی کو دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہوں مگر فوراً ہی جُھک کر سلام کرتا ہوں
اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پوچھتا ہوں کہ "بائی جی یہ مشعل ....!"

ایکدم سے اُن کے حسین و جمیل چہرے پر دلربا لرزش سی ہوتی ہے اور مُسکرا کر
کہتی ہیں "امراجی یہ تمہاری محبّت کی آگ ہے"

میرے مُنہ سے ایکدم سے ایک دردناک چیخ نکلی اور میں سوتے سے جاگ پڑا،
ایسا گھبرایا کہ اُسی دن سوجت کی راہ لی۔ بائی جی نے سچ مچ مجھے بیتاب کر دیا۔

جب میں سوجت پہنچا تو معلوم ہوا کہ کونبادتوں نے قلعہ میں اپنی فوج دُگنی
کر دی ہے اور محل کے چپہ چپہ پر پورا قبضہ ہے چنانچہ جب میں وہاں گیا تو مجھے
محل میں کسی نے گھُسنے بھی نہ دیا۔ مجبوراً میں نے سوجت میں قیام کیا۔

محل کے خاص خاص لوگوں اور رازدار درگاہوں سے ملا تو معلوم ہوا کہ کونبادت
اور بائی جی کے درمیان بائی جی کی ایک رشتہ کی دادی پڑی ہیں اور انہوں نے

بائی جی کو راضی کر لیا ہو۔ چنانچہ بہت جلد کونباوت کی شادی بائی جی سے ہو جائیگی۔ میرے لئے یہ خبر ناقابل برداشت تھی اور اب میں نے یہ سوچا کہ جان پر کھیل جاؤں۔ میں نے خود کونباوت سے ملنے کا ارادہ کیا مگر میں چاہتا تھا کہ کسی ایسی جگہ ملوں جو یہاں کے اثرات سے ملوّث نہ ہو۔ چنانچہ ایسا موقع بن۔ رہ دن کے اندر ہی اندر مل گیا۔ کونباوت کو کسی ضرورت سے جالور جانا پڑا اور جالور میں مجھے موقع ملا کہ میں کونباوت سے تنہائی میں بات چیت کر سکوں۔

ایک درخت کے نیچے ہم دونوں کھڑے تھے۔ کونباوت اپنے گھوڑے کی باگ ڈور پکڑے کھڑا تھا اور ہم دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں میرا خیال تھا کونباوت کو میرے اور بائی جی کے عشق و محبت کا علم نہ ہوگا لیکن یہ خیال غلط تھا کیوں کہ ملاقات ہوتے ہی پہلی بات جو کونباوت نے مجھ سے کہی وہ یہ تھی :-

"تم ہاتھی سے گنا لینا چاہتے ہو؟ نتیجہ معلوم ہے؟"

میں نے کہا "آپ بڑے جاگیردار کے کنور ہیں۔ آپ کو قلعہ چاہئے ہو محل چاہئے ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ آپ کو جاگیر بھی نہیں چاہئے۔ آپ تو قلعہ کی لالچ میں بائی جی کو چاہتے ہیں۔ میں چھوٹا آدمی ہوں اور بہتر ہے کہ آپ کوئی اونچا گھر دیکھیں کیا آپ کے سے بانکے کونباوت کے لیے یہ امر باعثِ ذلت نہیں کہ آپ اپنے روپے

پیسے کے زور سے اور حامیتوں کی تعداد کے زور سے جاڑیجی کو جیتنا چاہتے ہیں۔"

کونبادت کا نوجوان چہرہ غصّہ سے تمتما اٹھا اور اُس نے حقارت آمیز لہجہ میں مجھے جھڑک کر کہا: "یہ بالکل غلط ہے۔"

میں نے کہا: "پھر آؤ ہم تم تلوار سے فیصلہ کر لیں۔"

کونبادت نے جواب دیا: "مجھے کوئی ضرورت نہیں کہ تمہارے ایسے سپاہیوں سے لڑتا پھروں۔"

میں نے جل کر کہا: "کنور صاحب اچھی طرح سمجھ لیجئے اگر آپ چاہتے ہیں کہ جاڑیجی آپ کی ہو جائے تو مجھ سے جیتنا پڑے گی۔ اگر مجھ سے مقابلہ کی ہمت نہ ہو تو بہتر ہے کہ اس کا خیال دل سے نکال دیجئے۔"

کونبادت بولا میری تلوار غابیا تم جیسیوں سے بہتر لوگوں کے خون پینے کے لئے بنی ہے۔ لہٰذا بہتر ہے کہ تم یہاں سے دور رہو میں فضول کوئی نہیں چاہتا اور یاد رکھو اگر کہیں میں نے تمہیں وہاں آس پاس دیکھ لیا تو تمہارا سر تن سے جدا نظر آئے گا۔"

آخری لفظ کونبادت کے منہ سے ادا ہوئے ہیں کہ اُس نے اپنے سامنے میری پشت کی طرف اس طرح دیکھا کہ مجھے شبہ ہوا کہ میرے پیچھے سے کوئی آتا ہے جسے اس

نے دیکھا ہے سامنے کچھ فاصلہ پر کونباوت کے دو آدمی کھڑے تھے! ادھر
نظر ڈالی تو وہ غائب۔ لہٰذا کونباوت کی نظر میری پشت پر لگی ہے کہ میں نے بھی مڑ کر
دیکھا میرا دیکھنا تھا کہ ایکدم سے کونباوت کے وہی دونوں آدمی میرے اوپر ننگی
"تلواریں لیکر جھپٹ پڑے۔ اور کونباوت نے کہا "لینا" مگر قبل اس کے کہ میرے اوپر
حملہ ہو میں اچھل چکا تھا اور میری ڈھال میرے بائیں ہاتھ میں تھی' اور سروہی دائیں
ہاتھ میں۔ دونوں نے ایک جھپٹ کے ساتھ میرے اوپر وار کئے۔ ایک کے وار
کو میں نے ڈھال پر لیا اور دوسرے کے وار کو مجھے مجبوراً اپنی تلوار سے روکنا پڑا۔
یہ دونوں آدمی نہ معلوم کون ذات تھے مگر راجپوت نہیں تھے قتل کرنا چاہتے ہونگے
مگر لڑنا نہیں جانتے تھے چنانچہ میں نے چشم زدن میں ایک کا سر کاٹ دیا اور دوسرا
از خود بھاگ نکلا۔ اب میں کونبات کی طرف لپکا لیکن کونبات گھوڑے پر سوار ہو چکا
تھا اور اس کے ہاتھ میں برچھا تھا۔ ایکدم سے اس نے میرے اوپر گھوڑا ریل دیا۔
میں نے بمشکل اپنے کو بچایا ورنہ اس نے نیزے میں پرو لیا ہوتا میں نے سروہی کا ہاتھ
ترچھا لگا کر نیزہ روکا۔ کونباوت قہقہہ لگاتا نکل چلا گیا۔ غالباً وہ جانتا تھا کہ
مجھ سے مقابلہ آسان نہیں ہے اس کا ساتھی دور تک میرے پیچھے پیچھے آیا مگر
قریب نہ آیا جتنا تیز چلا مجھ سے ہو سکا میں چالوری بھاگ کر سوجت آیا اور یہاں

مجھے معلوم ہوا کہ بائی جی اب شادی کے لیے ہر چہار طرف سے دباؤ ڈال کر راضی کرلی گئی ہیں اور شادی کی تاریخ مقرر ہونا باقی ہے۔

(۴)

میری ہر کوشش بائی جی کو خط پہونچانے یا اُن کا صحیح حال معلوم کرنے کے لیے بیکار ثابت ہوئی۔ آخر ش وہ دن آیا کہ محل توپوں کی گرج سے گونجنے لگا۔ کوتناوت کی شادی بائی جی سے ہوگئی میں تڑپتا رہ گیا۔ اور اُس نے جاڑیچی کو بغیر لڑے بھڑے فتح کرلیا مگر نہیں۔ یہ کیونکر ممکن تھا میں تو ابھی زندہ تھا۔

صبح تین بجے شادی ہوئی تھی جس کا توپوں نے اعلان کیا تھا۔ میں نے پانچ منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ رات ہی کو چل کھڑا ہوا محل کیا تھا ایک سنگین قلعہ تھا مجھے یہ قلعہ فتح کرنا تھا۔

میں قلعہ کی پشت پر پہونچا۔ چٹان چھیل کر دیوار کی طرح کردی گئی تھی اور مجھے اس پر چڑھنا تھا۔ لوہے کی کیلیں گاڑ گاڑ کر بڑی محنت سے میں چٹان کا بلند ترین حصہ مزے میں چڑھ گیا۔ اس کے بعد پھر دشوار گذار اور خطرناک راستہ تھا۔ تمام چٹانوں کی چوڑی کگریں چھیل دی گئی تھیں اور تین مقامات مجھے ایسے

طے کرنا پڑے۔ جہاں میں دیوار سے چمٹ کر گلہری کی طرح گزرا۔ صبح ہوئی اور سورج نکل رہا تھا اور میں نے شاید ایک چوتھائی حصہ مسافت بھی طے نہ کیا تھا۔ دوگنہ کی بلندی پر پہونچنے میں مجھے پورے تین گھنٹے لگ گئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ گھنٹہ بھر میں ہی سامنے کھیتوں میں آدمی آجائیں گے۔ لہٰذا جلد سے جلد مجھے ایک منزل اور چڑھ جانا چاہیئے۔ جہاں میں پوشیدہ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ گھنٹہ بھر کی سخت مشقت اور محنت کے بعد میں اس قلعہ کی پشت کی چٹان کی ایک منزل اور طے کر چکا تھا۔ یہاں سے میں بڑی تیزی کے ساتھ دیوار سے لگا لگا دور تک چلا گیا اور ایسی جگہ پہونچ گیا جہاں سے قلعہ کی تعمیر شدہ دیوار شروع ہوتی تھی اس جگہ تھوڑا اور دوسرے بیچیا درختوں کی دو چار جھاڑیاں تھیں اور شام تک میں آرام سے اس جگہ سوگیا۔ میں اپنے ساتھ تھوڑا سا پانی لایا تھا اور تھوڑا سا کھانا۔ جب رات ایک گھڑی آئی تو میں نے کمر سے کمند کا لچھا نکال کر فصیل پر مارا۔ دوسری کوشش میں کامیابی ہوئی اور چشم زدن میں دیوار پر پہونچا اور کمند ہی کے ذریعہ آہستہ سے لٹک کر اندر پہونچ گیا۔ میں جس جگہ پہونچا ہوں یہ محل کے باغ کا سب سے اُجاڑ حصہ تھا اور جہاں میں ٹھہرا تھا اس جگہ سے سامنے بلندی پر رنگ محل چمک رہا تھا۔ راستے میں پتھر اور مٹی کے عظیم الشان ٹیلے تھے جو محل کی کرسی تک بلند ہوتے چلے گئے تھے۔

میں تھوڑا ہی آگے گیا تھا کہ مجھے معلوم ہوا کہ رنگ محل کے ارد گرد کوبناوت کا سخت پہرہ ہے کوئی آدھ گھنٹہ تک ادھر اُدھر پھرتا رہا مگر کسی طرف سے مجھے راہ نہ ملی اور میں مجبور ہو جاتا ہو کر رنگ محل کی پشت کی طرف جا کر بیٹھ گیا اور وہاں سے میں نے نظر رنگ محل کے پھاٹک پر جما دی تاکہ جس وقت کوبناوت اندر داخل ہو تو محل میں گھس جاؤں۔

آدھی رات کے قریب محل کے صدر دروازے پر سینکڑوں مشعلوں کی روشنی نظر پڑی۔ میں جانتا تھا کہ سب پہرہ دار جس وقت اس تیز روشنی کو دیکھتے ہونگے وہی موقعہ نکلنے کا ہے اور مجھے امید تھی کہ اندھیرے میں میرے چلنے کی اگر آہٹ بھی کسی نے سن لی اور روشنی کی طرف سے نظر ہٹا کر اندھیرے میں اگر مجھے دیکھنا چاہے گا تو مارے چکا چوند کے خاک بھی نہ دیکھ سکے گا۔

مشعلچیوں کے جلوس کے ساتھ کوبناوت پوری راٹھوری شان سے مع اپنے مسلح سپاہیوں کے داخل ہوا۔ ہر پہرے دار تماشا دیکھنے کو نہ صرف اپنی جگہ چھوڑ ذرا آگے بڑھ گیا بلکہ اپنے قریب والے کے پاس پہنچ گیا تاکہ اپنے سردار پر اچھی طرح رائے زنی کر سکے! اس زریں موقع سے میں نے فائدہ اٹھایا اور بڑی صفائی سے محل میں داخل ہو گیا۔ سب راستے میرے دیکھے ہوئے تھے۔ اس طرف

اول تو ویسے بھی روشنی کم تھی اور جو دو چار شمعیں تھیں اُن کو میں بجھاتا ہوا نشست کے زینے سے محل کی پہلی منزل پر پہونچا۔ اور وہاں سے ایک کھڑکی میں سے نکل کر چھجے پر پہونچا۔ آگے راستہ صاف تھا۔ جالیوں میں پیر رکھتا ہوا اور چھجوں کو پکڑتا ہوا محل کے بلند ترین حصّے یعنی تیسری منزل کی دُھر چھت پر جا پہونچا۔ اس چھت کے بیچوں بیچ میں ایک بڑا سا روشندان تھا جس کے اوپر ایک چھتری سی بنی ہوئی تھی۔ میں اس چھتری میں گھس گیا اور نہایت ہی خاموشی کے ساتھ میں نے اندر جھانک کے دیکھا۔

شروع جاڑوں کا موسم تھا۔ کمرہ دُلہن کی طرح سجا ہوا تھا اور جس وقت میں نے جھانک کے دیکھا ہے تمام داڈھیاں اور خادمتگارنیاں آپس میں ہنستی اور چہل کرتی کمرہ چھوڑ کر جا رہی تھیں کیونکہ کو بنا وت آ رہا تھا چشم زدن میں کمرہ بالکل خالی ہو گیا۔ بلکہ چاروں طرف سامنے چھت پر سے بھی عورتیں نیچے چلی گئیں اور سناٹا چھا گیا۔ کافی دیر ہو گئی اور سناٹا بدستور رہا۔ اتنے میں ایک سرسراہٹ کے ساتھ جاڑیچہ جی مجھے نظر آئی۔ سارا کمرہ جھاڑوں اور کنول کی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ عود، اگر اور لوبان کی خوشبوؤں سے سارا کمرہ مہک رہا تھا۔ اور جاڑیچہ جی حسنِ مجسّم، سولہ سنگھار کے آراستہ و پیراستہ، بال بال موتی پروئے کو بنا وت

کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اُس کے حسین اور خوبصورت چہرہ کو غور سے جھاڑوں اور فانوسوں کی روشنی میں دیکھا۔ حُسن و خوبصورتی کے نور سے سارا چہرہ دمک رہا تھا اور ایک دلربا سنجیدگی اُس کے چہرے پر اس طرح مسلط تھی کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے اندرونی جذبات گویا کچل کے رہ گئے تھے۔ طبیعت کی گرانباری کا اثر اور حُسن و سنگھار کے چہرے پر تھا۔ آنکھیں جلدی جلدی جھپک کر طبیعت کے اندرونی انتشار کو ہویدا کر رہی تھیں کہ اتنے میں کھٹکا ہوا۔ جاڑیجی جی کے چہرے پر ایک بجلی سی چمک گئی۔ کونباوت آگیا، دروازے میں داخل ہوا۔ بڑی آن بان سے شاندار صافہ باندھے ہیرے کی کلغی لگائے نہایت شان سے دولھا بنا داخل ہوا۔ جاڑیجی جی نے شرم سے سر جھکا لیا اور تھوڑا سا مُڑ گئی۔ کونباوت آہستہ سے اور گونہ احترام کے ساتھ جاڑیجی جی کی طرف بڑھا۔ اور جاڑیجی جی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سر جُھکایا ہی تھا کہ بیچوں بیچ کمرے میں نرم نرم غالیچوں پر میں بام سے کود پڑا۔ اور اُٹھتے اُٹھتے میں نے کہا "خبردار"

ایک بجلی تھی جو دفعتاً جاڑیجی اور کونباوت پر گری۔ مُنہ سے ایک دبی ہوئی چیخ نکلی اور کونباوت بھوچکا سا رہ گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر پُر زور مگر خاموش لہجے میں کونباوت سے کہا "خبردار! ابھی میں زندہ ہوں میں نہتا تیرے سامنے کھڑا ہوں۔

پہلے میرے خون سے ہاتھ رنگ لے۔" اور جاڑیجی جی سے میں نے کہا "دیکھو یہ تمہارے سامنے کھڑا ہے، جس نے مجھ سے مقابلہ کرنے سے انکار کیا۔ یہ بزدل ہے، جس نے اپنے نوکروں سے میرے اوپر پیچھے سے حملہ کرایا اور پھر میرے سامنے سے بھاگ گیا۔" پھر کو بناوت کی طرف متوجہ ہو کر کہا "کنور صاحب! میں سوت پہنتا کھڑا ہوں جو کچھ کرنا ہے کر لیجئے" اور میں آپ کے منہ پر کہتا ہوں کہ ان کو تم نے اپنے پیسے اور آدمیوں کے زور سے لینا چاہا ہے مگر تم نے دیکھ لیا کہ میں موجود ہوں۔"

جاڑیجی جی نے کو بناوت کی طرف دیکھا۔ چونکہ میں نے سچ کہا تھا اور وہ لیا میرے کہنے کی تکذیب کی متوقع تھی لہٰذا میں نے موقع کو دیکھتے ہوئے کو بناوت سے کہا "کو بناوت تم راجپوت ہو۔ جھوٹ نہیں بولو گے۔ لیکن اگر جھوٹ بول کر اپنی بات اونچی کرنی چاہتے ہو تو تمہیں اختیار ہے جو میں نے الزام دیئے ہیں ان سے یا انکار کر دو یا اقرار۔ اگر انکار کر دو تو میں ابھی چلا جاؤں گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں ایک پھر تم کو ابھی مقابلہ کی دعوت دیتا ہوں۔ تم مجھ سے مقابلہ کرنے سے ڈرتے ہو۔ لہٰذا یا تو مجھ سے مقابلہ کرو ورنہ کہہ دو کہ مجھ سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ تلوار نکال کر ابھی

میرا خاتمہ کر دو۔ یا ذلیل نوکروں کے ہاتھوں مجھے قتل کرا دو۔ تم جانتے ہو کہ ان تین باتوں میں سے راجپوت کس کو پسند کرتا ہے۔ مجھے جلدی جواب دو تاکہ قصہ ختم ہو۔"

کونباوت بھی آخر راجپوت تھا۔ اس کی ذلت اس کی بیوی کے سامنے ہوئی تھی۔ طیش میں آکر اس نے اپنی سروہی اور تلوار نکال کر فرش پر پھینک دی اور مجھ سے کہا۔

ان دونوں میں سے چاہے سروہی لیلے چاہے تلوار اور آجا میرے سامنے۔"

میں نے سروہی اٹھالی اور اس نے تلوار۔ ڈھال دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھی۔ میں نے تجویز کی کہ مسہری کے گول تکیے بجائے ڈھال کے مناسب ہوں گے۔ چنانچہ ایک تکیہ میں نے لے لیا اور ایک اس نے ہم دونوں آمنے سامنے آئے اور اس وقت میری نظر جاڑیچی جی کی نظروں سے چار ہوئیں میرے دل میں ایک برچھی سی لگی کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ گویا وہ میرے طرز عمل کی دل میں شاکی ہے کہ میں نے اس کے حجلۂ عروسی کو میدان قتال بنا دیا۔ ایکدم سے میرا دل ڈوب گیا اور میں نے سروہی اور تکیہ پھینک دیا۔ اور جاڑیچی جی سے نرمی سے کہا۔

"جاڑیچی جی مجھے معاف کرنا۔ میں نے خود غرضی کی۔ اگر کونباوت میرا مقابلہ نہیں کر سکتا اور مجھ سے ڈرتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ میں تمہاری زندگی تاراج

کرنے کے لئے اس طرح اُٹھوں، لہذا میں جاتا ہوں" وہ یہ کہہ کر میں پلٹا کہ ایکا یک سے لپک کر کونباوت نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا "او بیٹر تنیا! جاتا کہاں ہے؟ تو یہ چاہتا ہے کہ میرے منہ پر کالک لگا کر رفو چکر ہو جائے؟ اُٹھا سروہی[1]" یہ کہہ کر مجھے آگے کو کھینچ لیا۔ میں نے پھر انکار کیا اور چپ کھڑا جاڑیچی کی طرف دیکھنے لگا۔ کونباوت نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر مجھے جھڑکی دی اور سروہی اُٹھا کر میرے ہاتھ میں دی۔ تب میں نے خود جھک کر اُٹھا لیا اور ہم دونوں اپنی اپنی تلوار کا قبضہ پکڑ کر اور جوش جوانی میں جھوم کر آگے بڑھے۔ "او جے شری جاڑیچی جی!" میرے منہ سے نکلا اور چشم زدن میں تلواریں چمکنے لگیں۔ جاڑیچی جی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اور وہ پریشان ہو کر مسہری پر بیٹھ گئی اور ہماری جنگ کو دیکھنے لگی۔

کونباوت بزدل نہ تھا، اسیر تھا تلوار کا بھی دھنی تھا زیادہ تر ہم دونوں کے وار خالی جا رہے تھے کیونکہ ڈھال نہ ہونے سبب ہم دونوں ایک دوسرے سے با فاصلہ رہنے پر مجبور تھے لیکن تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو

---

[1] سروہی بہ نسبت تلوار کے زیادہ دھار دار اور ہلکی ہوتی ہے۔ راجپوت عموماً تلوار کی بجائے سروہی اور کھانڈا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ہلکے ہلکے زخم پہونچائے۔ میرے سینے پر تلوار کی نوک اچٹتی ہوئی لگی اور کونباوت کے
کے کاندھے پر لگی کبھی میں پیچھے ہٹتا چلا جاتا تھا اور کبھی وہ ہٹتا چلا جاتا تھا۔ ایک
دفعہ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا اور ایکا ایکی اُچھل کر میرے سر پر ایک سخت ضرب لگائی۔
میں نے تلوار والے ہاتھ اور تکیے والے ہاتھ دونوں ملا کر تکیہ سے وار کو روکا۔ مگر
تکیہ والے ہاتھ کی میری چھنگلی اُڑ گئی اور ہتھیلی کٹ گئی۔ مجھے داہنی طرف اُچھل کے
آنا پڑا۔ کونباوت نے بھی پینترا بدلا اور اب ہم دونوں اس طرح آمنے سامنے
تھے کہ جائیچی جی کی مسہری کونباوت کی پشت کی طرف تھی اور میرے مقابل میں
تھی لیکن اس پینترے پر بھی آتے ہی کونباوت نے پھر ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ میں نے
یہ ہاتھ تلوار سے روکا اور روکتے ہی میں نے چھوٹ کے ہاتھ شروع کر دیئے ایسے
کہ تین قدم کونباوت کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور سر تبا کر جو میں نے کونباوت کے سینے میں
سروہی کا ہولا دیا ہے تو اُس نے تکیہ سے روکا۔ سروہی تکیہ کو چھید کر سینے کو توڑتی
ہوئی پار نکل گئی اور کونباوت میرے ہولے کے زور سے جائیچی جی کے پاس ہی
مسہری پر گرا۔ جائیچی کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ میں نے سروہی ہاتھ سے چھوڑ دی
تھی جو کونباوت کے دل میں کھٹکی کی کھٹکی رہ گئی تھی۔ کونباوت نے تمکل دو تین ہچکیاں
لیں اور ختم ہو گیا۔ حجلہ عروسی میں خون ہی خون تھا اور مسہری کے ریشمین بستر پر

خون کا دریا بہہ رہا تھا۔ جاڑیجی جی اور میں دونوں مبہوت کھڑے تھے۔ اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سکتہ ہو گیا۔ میری نظریں چار ہوئیں اور اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "امراجی، تم نے مجھے بیوہ کر دیا۔"

"ہرگز نہیں" میں نے کہا۔ "ہرگز نہیں، میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔ تم میری ہو اور میں تمہارا ہوں۔ پھیرا اور دیا ؤ سے شادی نہیں ہوتی۔ کونباؤتوں کے برہمنوں کے اشلوک پڑھ دینے یا ہون کر دینے سے شادی نہیں ہوا کرتی۔ لہٰذا تم بیوہ نہیں ہو۔"

جاڑیجی نے کہا "نہیں تم غلط کہتے ہو۔ مجھے کونباوت سے نہ کبھی محبت تھی اور نہ ہو سکتی تھی اور یہ بھی تسلیم ہے کہ میری شادی زبردستی کی گئی۔ مگر میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتی کہ کونباوت مر گیا اور میں بیوہ نہیں ہوئی۔ میں تم سے محبت کرتی تھی اور چونکہ وہ محبت لافانی تھی لہٰذا اب بھی بدستور ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میں کونباوت کی بیوہ نہیں اور اُس کی لاش کے ساتھ نہ جل مروں۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "یہ نہیں ہو سکتا۔"

اُس نے کہا۔ "امراجی یہی ہوگا اور میں تمہیں اپنی لازوال محبت کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور مجھے ایک سچی راجپوتنی کی طرح کونباوت کی

لاش کے ساتھ جل مرنے دو تم جاؤ۔ یہاں سے جلدی جاؤ۔ ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بغیر بھی زندہ رہ سکوں گا۔"

جاڑیچی جی نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ دنیا کے پردے پر اس وقت مجھ سے محبت کرنے والا تم سے زیادہ کوئی نہیں ہے اور یہی میری تمنا ہے کہ میرے بعد میری محبت میں تم برسوں بیتاب ہو کر مچھلی کی طرح تڑپتے رہو تاکہ میری روح کو راحت پہنچتی رہے۔ کیونکہ میرے خیال میں میرے لئے اب صرف یہی امر باعثِ تسکین ہو سکتا ہے کہ میرے عشق میں تم ساری عمر جلتے رہو لہٰذا اب تم جاؤ یہاں سے اور مجھ سے وعدہ کرو کہ تم مجھے کبھی نہ بھولو گے اور مجھے یاد کرنے کے لئے عرصہ دراز تک زندہ رہو گے۔ بس جاؤ اب جاؤ...... جاؤ۔ جلدی جاؤ.... جاؤ" جاڑیچی کی آواز بھرّا گئی۔ مگر میں کیسے جاتا۔

"تم جاؤ" اُس نے پھر کہا۔ "تم جاؤ..... جاؤ....." اور یہ کہتے کہتے اُس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ اُس نے اپنے داہنے ہاتھ کی کلائی سے اپنی آنکھیں چھپا لیں اور روتی ہوئی جھٹکے کھاتی ہوئی آواز سے کہا۔ "...... جا...... ؤ......"

چشم زدن میں میں بھی رو رہا تھا وہ بھی رو رہی تھی اور ہائیں ہاتھ سے مجھے

ڈھکیل رہی تھی۔ میں کشاں کشاں نکالا جا رہا تھا۔ رکنا چاہتا تھا مگر رک نہ سکتا تھا
وہ مجھے ڈھکیلتی چلی گئی اور پشت کی طرف زینہ تھا اُس کے پاس لیجا کر مجھے کھڑا کر
کر دیا۔ اپنے آنسو پونچھے اور کہا۔ "امراجی تم جاؤ۔"

ان الفاظ میں ایک زور تھا۔ میں نے آخری نظر اُس پر ڈالی اور کہا جاتا ہوں۔
اُس نے ہاتھ سے پھر جھک کر اشارہ کیا اور میں زینے کی تاریکی میں ڈوب گیا۔

دوسرے ہی دن چاڑیکی جی گوتیاونت کی خونی لاش کے ساتھ جل مری۔
جب وہ ستی ہونے جا رہی تھی میں نے دور سے چھپ کر دیکھا۔ نظارہ ناقابل دید تھا۔
میں نے سچ مچ اُس کی چال کے ساتھ راجپوتی حسن و جلال کو جنبش میں دیکھا۔ پھر نہ دیکھ سکا
اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا لیکن طبیعت نہ مانی اور پھر بیتاب ہو کر دوڑا۔

آخری نظارہ ہولناک تھا۔ ایک چمکتا ہوا تارہ تھا جو برہمنوں کے اشلوکوں
اور ناقوسوں اور باجوں کی آوازوں کے مدوجزر پر چمکتا ہوا چتا پر پہونچا....
آگ ایسی خوبصورت چیز کو جلانے سے انکار کر رہی تھی۔ چتا اندر ہی اندر سلگ
رہی تھی اور چاڑیکی جی دھوئیں سے گھٹی جاتی تھی۔ دھوئیں کو وہ ہاتھ سے پریشان
کر رہی تھی.........

دھوئیں کے مرغولے کس قدر اُس کے لئے تکلیف دہ تھے۔ بھبکے کے بھبکے اُس

کے حسین اور خوبصورت چہرے کی طرف بڑھ کر اُس کی آنکھیں پھوڑ دینے پھر
کہ دھوئیں کی سیاہی میں اُس کا چہرہ چھپ گیا۔ گویا چاند سیاہ بادلی میں تھا۔
میں نے بیتاب ہو کر دل میں کہا ؏ "تم سے تم ایسے چھپے ہو جیسے چاند چھپے
اندھیری بدری" وہ بادلوں میں چھپی ہی تھی کہ...... الاماں.... ایک خوفناک
"بھقاڑے" کے ساتھ جو گرج سے مشابہ تھی ایکدم سے آگ بھڑک اُٹھی۔ دھواں غائب
تھا اور اُس کا چاند سا چہرہ چمکا ہی تھا کہ شعلوں نے ایک خوفناک جھپٹ کے ساتھ
اُس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی آتشیں چادر میں لپیٹ لیا۔ یہ معلوم ہوا کہ جیسے
دہکتے انگاروں پر کسی نے خوبصورت تتلی ڈال دی۔ تھرتھرا کر اور کانپ کر رہ گئی۔
اور چشم زدن میں جاڑیسچی کا تن نازنین ایک سلگتی ہوئی بھیانک لاش تھا۔ میری ایکدم
سے آنکھیں چڑھ گئیں اور میں بادلوں کی طرح ایک سمت دوڑا چلا گیا۔

۱؎ جاڑیسچی فنا ہو گئی مگر اُس نے نہ تو یہ بتایا کہ کونیاونت کا قاتل کون تھا
اور نہ یہ بتایا کہ قتل کس طرح ہوا۔

(۵)

دو روز تک میں نے کچھ نہ کھایا نہ پیا۔ جاڑیسچی کی لازوال محبت کا دریا تھا

کہ میں اُس میں ڈوب کر رہ گیا۔ لیکن افسوس صد افسوس۔ حیف ہے جاڑیچی کے حُسن وجوانی پر کہ ... ئی کے عشق و محبت کی ہیر نے ذرا پروانہ کی اور چشم زدن میں اُس کی نامراد جوانی اور سچے عشق و محبت کی پاک یاد کو نہ صرف دل سے مٹا دیا بلکہ سچ مچ لفظ "محبت" کو میں نے جوتوں سے روند ڈالا۔

میں نے متاثر ہو کر حیرت سے پوچھا "وہ کیسے؟ حالانکہ میں نے آپ کی زبانی اس نامراد کا قصہ سنا ہو مگر میں صحیح عرض کرتا ہوں کہ جاڑیچی جی کی عجیب غریب محبت کی داستان میرے دل سے کبھی محو نہ ہوگی پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ نے اس کو بھلا دیا......"

"نہیں نہیں۔ بھلا نہیں دیا بلکہ اُس کی محبت کو پامال کر ڈالا اور پھر اُس کی...."

سادھو نے کچھ کہتے کہتے زبان روک لی اور پھر رُک کر کہا۔ لو اب سنو کہ میں نے کس طرح جاڑیچی جی کی محبت کا خون کیا۔

بائی تمری بھٹیانی[۱] جی

"میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ ٹھکانہ پرسٹو کے موضع گانوڑی کا ایڑ تیا امر سنگھ راٹھور تمہارے سامنے بیٹھا ہے۔ نہ معلوم وہ گاؤں ہے کہ مٹ گیا۔"

میں نے کہا۔ "ہے میں جانتا ہوں۔"

"اچھا۔ تو اُسی گاؤں کا رہنے والا ہوں اور وہاں سے کچھ فاصلہ پر موضع سُبحان گڑھ ہے۔"

میں نے کہا میں سُبحان گڑھ کو بھی جانتا ہوں بلکہ وہاں تو کئی دفعہ گیا

---

[۱] راجپوتوں کی قوم بھاٹی۔

بھی ہوں"

۔ دھن نے کہا "میرا ایک جگری دوست میٹر تیاجنجا رسنگھ تھا جو جیتے سے میں دیوانہ وار اپنے گاؤں بھاگا۔ اور یہاں جنجا رسنگھ کی صحبت نے بہت کچھ غم غلط کر دیا۔ جنجا رسنگھ بڑا زندہ دل اور منچلا میٹر تیا تھا اور یہ جلد میرا اس کا ساتھ رہنے لگا۔ گو میرا دل دنیا کی کسی چیز میں نہ لگتا تھا اور ہر وقت جاڑیچی جی کی غمناک حسین صورت سامنے رہتی تھی، لیکن جنجا رسنگھ کی زندہ دلی کم از کم ایک وقتی دلبستگی بن کر سکون پیدا کر دیتی تھی۔

جاڑیچی جی کو بھسم ہوئے چوتھا مہینہ چلتا تھا کہ ایک روز کا ذکر ہے کہ ہم دونوں شکار کو گئے۔ ہم دونوں گھوڑوں پر تھے اور ہمارا دروغہ (غلام) اونٹ پر تھا۔ شکار وغیرہ تو ملا نہیں اور ہم لوٹنے والے ہی تھے کہ کیا دیکھتے ہیں کہ دو اونٹ چلے آرہے ہیں۔ آگے کے اونٹ پر ایک راجپوت بیٹھا تھا، پیچھے کے اونٹ پر دو پردہ پوش عورتیں بیٹھی تھیں اور ان کے ساتھ ایک آدمی تھا جو دروغہ معلوم ہوتا تھا۔

آہ! وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ راجپوتوں کو اس میں مزہ آتا تھا کہ راستہ چلتے خواہ مخواہ کسی سے جھگڑ پڑیں۔ یا زیر کر کے اس کا مال و اسباب چھین لیں یہ

ڈاکہ نہیں تھا بلکہ خوشی کا سودا تھا جس کا جی چاہے ہماری سوائی[51] مان دے اور ہاتھ جوڑ کر مزے میں چلا جائے ورنہ ہم سے لڑے۔ مارے یا مرے۔

جنجار سنگھ نے اونٹوں کو دیکھتے ہی کہا۔ "آہاہا! چلو ان سے سوائی منوائیں۔ کہنے کی دیر تھی کہ گھوڑوں کو ہم نے مہمیز کیا اور تلواریں سونت کر اونٹوں کا راستہ کاٹ کر کھڑے ہو گئے۔

یہ دیکھتے ہی آگے والے اونٹ پر سے تڑپ کر راجپوت نیچے کو کود پڑا اور کڑک کر اس نے ہماری گستاخی کی وجہ پوچھی۔ ہم نے بتا دیا کہ ہم سوائی منوانے آئے ہیں۔

یہ سن کر اس نے پوچھا "تم کون ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "میڑتیا۔"

جنجار سنگھ نے اس کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ "میڑتیوں کی سوائی ماننے میں توہین نہیں ہوتی۔"

راجپوت نے طنز سے سر کو جنبش دے کر کہا۔ "متھانیہ[52] کے جوہان تو نے نہیں دیکھے ہوں گے۔" عورتوں والے اونٹ کی طرف اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "راجا پیشور کی

---

۵۱ یعنی تم سیر ہو ہم سوا سیر اور تم سے بھاری ہیں۔ ۵۲ جودھپور کا ایک چھوٹا سا گاؤں

ٹھکرانی میری بہن چوہانی جی اور اُس کی لڑکی ہے۔ اور کیا بہتر نہ ہو کہ ایک چوہانی تمہیں جوتیاں مار کے بھگا دے۔ کل کے لونڈے چوہانوں سے سوائی منوانے آئے ہیں" یہ کہہ کر ہم دونوں کی طرف حقارت سے دیکھ کر اپنا کھانڈا میان میں رکھنے لگا۔

میں نے کہا "ٹھاکراں ——— یہ کھانڈا اکیلے کہے گا؟ اس کو میان ہی کیا بغیر خون چٹائے یونہی رکھو گے؟ میٹرتیوں کا خون تو ایسے کھانڈے ہی کو ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمہارے کھانڈے نے اب تک بھیل یا بنیوں[۵۱] ہی کا خون چکھا ہے۔ ...

لے اپنا کام، سیدھی طرح کھانڈا اپنا ورنہ ہم لئے جاتے ہیں چوہانی جی کو۔"

یہ سنتے ہی بھائی تو بھائی خود دلہن یعنی چوہانی اونٹ پر سے للکاری:-

"ہے ٹھاکراں[۵۲]! ..... مجھے تو دے سروہی!" اپنے درو غم سے بولی اور للکار کر کہا "جھکا دے[۵۳] اونٹ

---

۵۱ بانیے بھی بھیلوں کی طرح جنگلی مگر ارذل قوم ہے۔

۵۲ مارواڑی زبان میں داماد کیلئے جب صیغہ جمع بولتے ہیں تو مراد احترام اور عزت ہوتی ہے۔

۵۳ بٹھا دے۔

اندر راونت کے جھکتے جھکتے چوہان نے دروغہ کے کمر پٹکے سے سروہی سونت لی اور پوری راجپوتی شان سے پردے کو خبر یاد کہا۔ چادر سے خوبصورت چہرہ نکلا اور ایک طرف کا ناچھے سے چادر سرک کر نیچے آ گئی اور راونٹ پر سے بیٹھے ہی بیٹھے اُس نے دونوں پیر ایک طرف کئے۔ اور ہم دونوں کو چیلنج کیا اور راپنے بھائی کو ڈپٹا جو کھانڈے سے ہمارے اوپر حملہ کرنے کو تھا۔

مگر میں تو اب کسی اور ہی طرف متوجہ تھا۔ ٹھکرانی کی خوبصورت نوجوان لڑکی جو اُن کے آگے بیٹھی تھی ایک لرباسادگی کے ساتھ اپنی ماں کے کندھے کی طرف سے منہ پر سے چادر ہٹائے دیکھنے لگی اور میں اس کے ملکوتی حسن سے متاثر ہو کر اُدھر دیکھنے لگا۔

ہم نے ٹھکرانی صاحب کے ہاتھ جوڑ کر کہا: ''ماتاجی ہم آپ سے نہیں لڑتے۔ نہ ہم آپ سے سوانی منواتے ہیں۔ ہم تو آپ کے بھائی سے سوانی منواتے ہیں''۔ یہ کہہ کر میں نے اپنی تلوار نیام سے کھینچی اور چوہان کی طرف بڑھ کر ڈپٹ کر کہا، ''چھوڑ دے اپنا کھانڈا۔۔۔۔۔ ڈال دے کھانڈا۔ سوانی میری ہے''۔

چوہان نے پھرتی سے اپنا کھانڈا کھینچا اور دو ہتڑ تان کر پینترا بدل کر کھڑا ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس خوفناک کھانڈے کی بیسا میں ہم کیا کوئی بھی آتا تو دو ہو جاتے۔

لہٰذا میں نے بائیں ہاتھ سے زمین پر سے ریت اٹھائی اور داہنے ہاتھ میں تلوار سنبھالتے ہوئے چوہان کے منہ پر پھینکنا شروع کی یہ کہہ کر کہ "بول میری سوائی ...... مان میری سوائی"۔

چوہان آگ بگولا ہو گیا اور اس نے ایک دم سے گویا اڑ کر ایک زور کی جھپٹ کے ساتھ اس زور سے کھانڈے کا دوہتڑ دیا کہ اگر بچا نہ جاؤں تو دو ہو جاؤں۔ میں نے تڑپ کر کھانڈا خالی دیا اور اس صفائی سے تلوار چمکائی کہ بھرپور ہاتھ چوہان کے داہنے شانے پر پڑا۔ خون کا فوارہ نکلا۔ چوہان کے ہاتھ سے کھانڈا چھوٹ گیا۔ میں نے تلوار پلٹ کر کے نعرہ مارا۔ "رنڑبنکا راٹھور[1]...... بول سوائی بیٹر تیا کی[2]......" یہ کہہ کر میں چوہانی کے داروغہ کی طرف لپکا۔

چوہانی جی کا داروغہ سہم گیا اور میری تلوار کی چمک سے وہ بول اٹھا۔ "سوائی ہے بیٹر تیا...... سرداراں رکھی......"

ایک تو بھائی کا زخمی ہو کر گرنا اور دوسرے داروغہ کا ہماری سوائی مان لینا۔ چوہانی نے غضبناک شیرنی کی طرح شکست کی چوٹ سے بیتاب ہو کر

---

[1] راٹھوڑوں کا قومی نعرہ یعنی راٹھوڑان کا بانکا ہے   [2] بمعنی کی۔

ایک چیخ کے ساتھ خود اپنے داروغہ پر سروہی کا وار کر دیا۔ اس نے کیوں ہماری سوتیلی مان لی اور جادنہ نکلتی ہوئی۔ سروہی ہاتھ میں، خون فشاں نظروں سے ہمیں دیکھتی ہوئی اپنے بھائی کی طرف چلی۔ جو زخم کے صدمہ سے بیہوش پڑا تھا۔

چوہانی کی ماہ پیکر صاحبزادی صاحبہ بھی ماں کے ساتھ ماموں کی تیمارداری کو بڑھیں۔ میں تو اس شعلۂ حسن کی جنبشوں کو دیکھ کر مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔ ماں بیٹیاں قریب پہنچیں اور چوہانی نے بھائی کا زخم دیکھتے ہوئے اپنے داروغہ کو آواز دی کہ پانی کی چھاگل لائے۔ اس غریب کی پشت میں سروہی کا اوچھا سا زخم لگا تھا۔ وہ اس کی دیکھ بھال میں مشغول تھا۔ میں نے دوڑ کر اونٹ پر سے چھاگل کھولی اور لا کر چوہانی جی کو دی۔

مغرور ٹھکرانی نے تیور بدل کر چھاگل لی مگر جل کر کہا "ٹھاکران تم یہاں سے جاؤ۔ ہٹو پرے۔"

ہم دونوں ذرا ہٹ آئے اور ہم نے دیکھا کہ ماں بیٹیوں نے کپڑے ہٹا کر زخم کھولا۔ دونوں کے خوبصورت ہاتھ خون میں لال ہو گئے۔ ابھی ہم دونوں اس پارۂ حسن کو دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ٹھکرانی کو یہ نظارہ بازی پسند نہ تھی اور اس نے اب جھڑک کر ہم سے جانے کو کہا۔ ہم نے اب ٹھہرنا مناسب نہ

سمجھا اور ٹھکرانی کی طرف ہاتھ جوڑ کر "جے شری ماتا" کہکر کہا کہ "[51] سبیک کرتے ہیں" اور یہ کہہ کر میں اپنے شکست خوردہ دشمن کا کھانڈا لینے جھکا۔ فتح کی نشانی دشمن کی تلوار ہی ہوتی ہے ٹھکرانی اپنے بھائی کو چھوڑ کر چیخ کر اٹھی اور کھانڈا اپنے قبضہ میں کر کے ہمیں ایک ڈپٹ دی کہ بھاگو۔ ہم نے کہا کہ جانے دو کھانڈا اور "سبیک" کی ہے دوبارہ، کہ ایکایک ہم سے سامنے سے گرد و غبار کا طوفان اور "جودھوں"[52] کے جنگی نعروں کی آواز آئی۔ سر اٹھا کر جو دیکھتے ہیں تو چھ سوار چلے آرہے ہیں۔ ٹھکرانی کا چہرہ فق ہو گیا۔ بھائی کی تیمارداری چھوڑ کر اُس نے ماتھا اپنا پیٹ لیا۔ اپنی خوبصورت لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جھپٹ کر اپنے اونٹ کے پاس آئی کہ اتنے میں سوار قریب ہی آگئے۔ ان کا سردار بھاری بھرکم آدمی کوئی ۳۵ برس کی عمر۔ قوی ہیکل سیاہ فام۔ بانکی پگڑی سر پر۔ کان میں مُندرے لٹکے۔ اُس نے شاید ہمیں چوہانی جی کا آدمی سمجھا اور کڑک کر بولا۔ "ماں سوتی جودھوں کی...... لاؤ میری بھٹیانی"۔ یہ کہہ کر اُس نے دوشیزہ کی طرف اس طرح گھور کر دیکھا کہ میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ نظریں کہہ رہی تھیں کہ کیا معاملہ ہے لڑکی کو لینا چاہتا ہے۔ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ان لوگوں کو جانتا ہے و نیز یہ کہ چوہانی جی

---

۵۱ یہ اجازت دیجئے۔

۵۲ جودھانی کی اولاد راٹھوروں کی شاخ ہے۔

کے ٹھاکر بھائی ہیں۔

ٹھکرانی نے گھبرائی ہوئی آواز سے اُس سے کہا: "خیریت چاہتا ہے تو لوٹ جا۔" اپنی بیٹی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تجھے یہ زنانہ نہیں مل سکتی۔"

میں نے کڑک کر کہا: "تم کون ہو؟"

خوفناک جودھے نے کہا: "اے چھوکرے لاؤنون[1] کے جودھوں کو نہیں جانتا۔ (دوشیزہ کی طرف انگلی اٹھا کر) یہ میری ہے۔ تو کون ہے؟ داروغہ ہے چوہانی جی کا؟"

بس یہ کہنا تھا کہ غضب ہو گیا۔ جیجا رسنگھ کا اور میرا اس طعنہ پر راجپوتی خون کھول گیا۔ میں نے اپنے داروغہ کو گالی دے کر کہا: "لاؤ تو میرا کھانڈا۔" اور پھر ہم دونوں نے اس خوفناک جودھے کی طرف دانت پیس کر کہا: "جودھوں کے داروغہ ذرا ٹھہر تو جا۔"

چوہانی کا داروغہ ہمیں ہمت بڑھانے کو بولا "جے سوائی شری بیٹریاں ری" اُدھر اس خونی جودھے نے جنبش کی کہ ٹھکرانی نے جھٹ سے اپنی خوبصورت

---

[1] لاؤنون تعظیمی ٹھکانہ جودھیوں کی۔

لڑکی کے ہاتھ سے کنگن اتار کر سامنے ریت پر پھینک دیا۔ اور ہماری طرف دیکھ کر جوش میں پکاری "اے میٹر تیا بھائیوں کا کنگن۔ دیکھوں تو سہی بھائیوں کا کنگن جودھو جودھوں سے کیسے جیتتا ہے۔ اس کنگن کی اور میٹر تیوں کے کھانڈے کی لاج آج تو تیرے ہاتھ ہے (لڑکی کا ننگا ہاتھ اونچا کر کے بولی) یہ کھٹیانی تیری راہ دیکھتا کیا ہے سامنے کنگن پڑا اٹھا کر پہنا دے۔"

اب خود سوچیے کہ میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ دوشیزہ بھٹیانی سے جو میری آنکھ ملی ہے تو اس کی خوبصورت آنکھوں نے کہا۔ "یا کہ میں تیری لونڈی ہوں میرا ننگا ہاتھ ہے اس میں کنگن پہنا دے۔"

میں تیزی سے کنگن کی طرف بڑھا۔

جودھانے للکار کر کہا "او دروغے! خبردار! کنگن مت اٹھا" یہ کہہ کر اپنے گھوڑے پر سے کود پڑا۔ اور کھانڈا لے کر آگے بڑھا میں نے کھانڈا پیچھے پھینکا اور اپنے داروغہ سے ڈھال لی اور تلوار سونت کر چمک کے آگے بڑھا۔ دیو پیکر جودھا نے پینترا بدل کر اپنا کھانڈا تولا اور آگے بڑھ کر حملہ شروع کیا

---

۵۱ یہ نہایت ہلکی تلوار ہے جو سروہی سے بھی زیادہ دھار دار ہوتی ہے۔

چشم زدن میں گرز کی طرح اُس نے میرے سر پر کھانڈے کا وار کیا۔ میں نے کھانڈا ڈھال پر لیا اور اُچھل کے ساتھ کمال بڑی پھرتی سے اپنا وار چلایا۔ مگر جودھا سر بچا گیا۔ دونوں پیچھے ہٹے۔ جودھا سمجھ گیا کہ اس پھرتیلے راجپوت کے خلاف کھانڈا کام نہیں دے گا۔ لہٰذا اُس نے کھانڈا پھینک کر اپنی تلوار سونتی۔ اُس کے داروغہ نے لپک کر کھانڈا اٹھا لیا اور ڈھال ہاتھ میں دے دی اور اب جودھا نے میرے اوپر وار کرنے شروع کئے۔ مہلت نہ دی۔ ہر پینترہ پر جودھے کا قدم آگے تھا اور میں پیچھے سرکنے پر مجبور تھا۔ جودھا کا تیغا تڑپ تڑپ کر میری ڈھال پر گر رہا تھا۔ ہر وار پر معلوم ہوتا کہ میرے دو ہو جائیں گے مگر ڈھال موقع پر پہنچ جاتی۔ اُس وقت اُس حسین دوشیزہ کا عجیب حال تھا۔ خوبصورت ہونٹ حیرت اور استعجاب سے ذرا کھلے ہوئے۔ اُس کو خبر بھی نہیں کہ چادر سرک کر کاندھے سے گر چکی ہے اور چاند سا چہرہ کھلا ہوا ہے۔ وہ تو جنگ کی کشمکش دیکھ رہی تھی۔ تلوار کی ہر ضرب پر اُس کے خوبصورت اور حسین چہرے کے ذراتِ حسن لرز جاتے تھے۔

جودھا نے میرے سر پر ضربوں کی بارش کر دی تھی۔ جھنا جھن۔ جھنا جھن جودھا کی تلوار میری ڈھال پر تڑپ تڑپ گر رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے جودھا کے پہلے حملہ کا زور شور گھٹتا معلوم ہوا۔ ضربات کی برق

رفتار ہی ذرا ہلکی پڑی۔ میرا پیچھے ہٹنا ذرا کم ہوا۔ کہ جودھا نے کمر تیا کر ایک وار
جو کیا ہے تو گو اُوچھا پڑا۔ مگر پگڑی کاٹ کر تلوار میرے سر پہ زخم دے گئی اور
چشم زدن میں میرے سر سے بہہ کر خون چہرے پر آنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ نوجوان
بھٹیانی کا چہرہ رنج وغم سے لرز کر رہ گیا۔ مگر نہیں۔ میرے بدن میں کافی خون تھا
اور پھر جوان اور مضبوط بھی تھا۔ اور میری ہمت اور قوت میں ذرا فرق نہ آیا۔ گو میں
برابر مدافعانہ جنگ کر رہا تھا۔ منہ پر سے خون آتا وہ کندھے سے اپنے پونچھا جاتا تھا
مگر جودھا کا خوفناک تیغا بلکو تڑپ تڑپ کر میرے سر پہ گر رہا تھا کہ اتنے میں
جودھا کا دوسرا وار میرے کندھے پر لگا۔ مگر ڈھال پر سے اُوچٹ کر لگا۔
لہٰذا اوچھا پڑا مگر تلوار گوشت میں ضرور گھس گئی۔ اب مجھے ڈر لگا کہ کہیں مار نہ کھاجاؤں
دوشیزہ اور اس کی ماں کی حالت قابل رحم تھی۔

مگر خوفناک جودھا بھی شل ہو گیا تھا۔ مسلسل تلوار چلانا آسان نہیں ہے۔
ایک لمحہ کا اُس کو آرام نہ ملا تھا۔ اُس کو نہیں معلوم تھا کہ میں اسکو تھکا دوں گا۔
اور دراصل وہ اب ہانپ رہا تھا۔ میں دراصل باوجود اپنے زخموں کے تازہ دم تھا۔
جودھا کے ہاتھ میں سستی آگئی اس کی ضرب ایک گونہ تکلیف اور سستی کے ساتھ
پڑ رہی تھی اور جودھا نے اب دیکھ لیا کہ اگر اور کچھ دیر یہی حال رہا تو ایسا شل ہو جائیگا

کہ اُٹھنا دشوار ہوگا۔ غالباً یہی سوچ کر اور اپنی شکست سے ڈر کر اب اُس نے اور چال چلی۔

میں نے اب ہنسنا بند کر دیا تھا اور چٹان کی طرح ڈٹا کھڑا تھا کہ جودھا نے ایک دم سے نعرہ مار کر ایک بھرپور دست وار کیا اور ساتھ ہی اچھل کر اپنی ڈھال کی ادھیڑ میرے منہ پر ماری۔ جودھا کی ڈھال کے بیچوں بیچ میں ایک بالشت بھر کا برچھا لگا ہوا تھا کہ بچانے اور مارنے دونوں کام میں آسکے۔

میں نے وار کو تو ڈھال پر کاٹا اور ڈھال کی ادھیڑ سے بچنے کو پیچھے اُڑا اور اُڑتے ہی میں نے جودھا کے بائیں شانہ پر ایسا جنیو کا ہاتھ دیا کہ اُونا جودھا کی پسلی پر جا کر رُکا۔ جودھا کے ہاتھ سے ڈھال اور تلوار گری اور گرتے گرتے میں نے اُونے سے ایک طمانچہ کا ہاتھ جو دیا ہے تو رخسار کاٹتا ہوا اُونا جا کر جودھا کے دوسرے گال کی ہڈی پر بولا۔

بے ساختہ دونوں ماں بیٹیوں کے منہ سے نکلا۔

”جے سوائی مِتری میٹر بتیالے کھانڈارادی“

میں نے نعرہ مارا ”رنڈ بنہارا ٹھور“ اور دیوانہ وار دوڑ کر اُونا پھینک کر اپنا کھانڈا لیا اور اُس میں لنگی پرو کر ناچنے لگا۔ جودھوں میں سے کسی کی ہمت نہ تھی جو

آگے بڑھا۔

"جے شری میٹر تیارے کھانڈا اری" جنجار سنگھ نے نعرہ مارا۔

میں نے اپنا کھانڈا اٹھا لیا۔ کیا جو کنگن پہنے ہوئے تھا۔ جنجار سنگھ دوڑ کر چوہانی جی کے پاس آیا۔ اور دوشیزہ کا داہنا ہاتھ پکڑ کر اس نے کھینچا اور سب مجھے آواز دی۔ دوشیزہ شرمائی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں اکڑتا مسکراتا بھٹیانی کے پاس پہنچا۔ اس نے میری طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور میں نے پھرتی سے اپنے کھانڈے میں سے کنگن نکال کر اپنی محبوبہ کے نازک اور خوبصورت ہاتھ میں پہنا دیا۔ اور اس کا ہاتھ اٹھا کر احترام سے اپنی آنکھوں سے لگا کر آہستہ سے چھوڑ دیا۔ اور چھوڑتے ہی کھانڈا لیکر ہم دونوں گھوم کر اس طرف متوجہ ہوئے اور للکار کر ہم نے دشمن سواروں سے کہا:۔

"بول سوائی شری میٹر تیاں ری؟"

ہم چار آدمی تھے۔ دونوں ہم اور دو ہمارے داروغہ۔ اور پانچویں ٹھکرانی چوہانی جی جن کے ہاتھ میں سروہی تھی۔

دشمن نے ہماری سوائی نہ مانی اور ہم دونوں لپکے اپنے گھوڑوں کی طرف اور داروغہ کو آواز دی کہ لانا برچھی۔

مگر جودھوں کی ہمت پست تھی غالباً اُن میں سپاہی اور داروغہ تھے یہ سب کے سب دُم دبا کر بھاگے اور ہم نے اپنے جے کاروں سے ریگستان سر پہ اُٹھا لیا۔

"وجے سوائی سنری میٹر تیان رے کھانڈاری۔"

(۷)

اِس شعلہ نوجوان بھٹیانی نے دَم کے دَم میں مجھے دیوانہ کر دیا۔ ڈبو کر رکھ دیا۔ کہاں کی جاڑیچی جی اور کیسی جاڑیچی جی۔ موہنی مورت چمکتے ہوئے "اونے" کی طرح دل میں گھپ کر رہ گئی...... جاڑیچی کی محبت پامال کر ڈالی!.... حیف صد حیف۔ راجپوت بھی کیسا ظالم ہوتا ہے......"

اتنا کہہ کر سادھو ذرا دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ اُس کی حالت قابلِ رحم تھی۔ میں نے بھی خاموش رہنا بہتر سمجھا کہ وہ خود ہی بولا:۔

"...... جاڑیچی جی بیشک راجپوتنی حُسن و خوبصورتی کا بہترین نمونہ تھی لیکن بھٹیانی اَور ہی چیز تھی۔ میں کیا کہوں ایسی شکل شاید ایک ہزار برس میں راجپوتانہ پیش نہ کر سکے گا۔ قصہ مختصر صورت شکل تھی اُس کی کہ حُسن کی تصویر۔ جس کی نظریں اپنے محبوب سردار کے کلیجہ میں اُتر جاتی تھیں۔ جودھانے جو اپنی ڈھال کی برچھی

کا ہولا دیا تھا وہ میری ٹھوڑی کے نیچے لگا۔ بہت خفیف سا زخم تھا۔ سر کا زخم بھی کچھ زیادہ نہ تھا۔ اب سب سے پہلے تو ٹھکرانی نے اپنے بھائی کی مرہم پٹی کی۔ اُن کا نام رام سنگھ چوہان تھا۔ چوہانی کے ریشمی دوپٹے اور رومالوں کو جلا کر زخم پہ رکھا گیا۔ رام سنگھ جی کو ہوش آ گیا تھا مگر نقاہت تھی۔ میرے سر میں بھی ریشم بھر دیا گیا اور کندھے پر کپڑا باندھ دیا گیا۔

ٹھکرانی نے مجھ سے کہا "آج میڑتیوں کے کھانڈے نے بھاٹیوں کا کنگن جیت لیا ہے راٹھور[۵۱]" یہ (اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کرکے) بھٹیانی اب تیری اور تیرے کھانڈے کی چیری[۵۲] ہے۔ تو جان اور تیرے کھانڈے کی کمائی۔ جی چاہے ابھی اپنی جیتی ہوئی کمائی اپنے گھوڑے پر بٹھا کر گھر لے جا اور جی چاہے میرے گھر چل اور دیکھ کہ راجا بیشور کی ٹھکرانی اپنی بیٹی کو کیا دائجا (دہیز یعنی جہیز) دیتی ہے۔"

یہ سنتے ہی مارے خوشی کے میری جان کھنچنے لگی۔ دل میں محبت کا درد سا ہونے لگا اور میں خوشی کے لہجہ میں بولا۔ مجھے "دائجا بھائجا" کچھ نہیں چاہئے۔ مجھے تو میری بھٹیانی دیدو۔"

---

[۵۱] محبت کا لفظ

[۵۲] باندی لونڈی

یہ کہہ کر میں نے نوجوان بھٹیانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ نوجوان دوشیزہ نے تڑپ کر اپنی ماں کی چادر کو پکڑا اور جگہ سے نہ ہلی۔ مارے شرم کے گری جانے لگی کہ میں نے ہنس کر کہا "لئے جاتا ہوں اپنی بھٹیانی رانی"۔ اور یہ کہہ کر میں نے گود میں لیکر پھول کی طرح اپنی بھٹیانی کو اٹھا کر اپنے گھوڑے پر بٹھا دیا۔ نوجوان دوشیزہ منہ چھپا کر رونے لگی اور ٹھکرانی کی آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ چنانچہ رتن سنگھ نے گھوڑا ٹھکرانی کے قریب کر دیا۔ ماں بیٹی کو دلاسا دینے لگی۔ اور چمکار کر سمجھانے لگی۔

میری تو یہی مرضی تھی کہ اپنی دلہن کو لے کر ابھی لوٹ جاؤں کہ ٹھکرانی کچھ متفکر سی ہو گئی اور اندیشہ ظاہر کیا کہ راجلدیشور تک زخمی بھائی کو لے جانا نہ صرف مشکل ہو گا بلکہ جودھوں کے حملے کا خطرہ بھی ہو گا۔ یہ جودھا جو مارا گیا ٹھکرانی کا بڑا زبردست دشمن تھا۔ لہٰذا یہ بات طے ہوئی کہ ہم دونوں راجلدیشور چلیں ٹھکرانی اور بھی خوش تھی کہ اپنی لڑکی کو ٹھاٹ کیساتھ رخصت کر سکے گی۔

میں نے مقتول کا کھانڈا اپنے دروغہ اور ڈھال وغیرہ اور زیور جو کچھ بھی تھا ٹھکرانی کے دروغہ کو انعام میں دیدیا۔

(۸)

چوتھے روز ہم راجلدیشور پہونچے اور فوراً طے کیا کہ میری دلہن رخصت

کر دی جائے۔

الغرض شادی کی محفل گرم ہوئی بھاٹیوں کے چارن[۵۱] اور بھاٹ جنگ لے کر آگئے۔ بھاٹیوں اور میڑتیوں کی تلواروں کے افسانے چنگ پر اڑنے لگے۔ بھائی دو آتشہ کے جام پی۔ پی کر جھومنے لگے۔ جلسہ عین رنگ پر آیا میں دولہا بنا بیٹھا تھا اور پھیرے پڑنے والے ہی تھے کہ میڑتہ[۵۲] سے میری بہن کا دروغہ ایک ایسی سنانی لایا کہ بس غضب ہی ہو گیا۔

وہ خبر وحشت اثر یہ تھی کہ جے پور کے کچھواہوں اور مرہٹوں کے دل نے میڑتہ لوٹ لیا۔ قصبہ میں آگ دے دی اور راٹھوڑیوں کو چن چن کر کے بازار بیچ ڈالا اور خود میری بہن ٹکے[۵۳] میں بک گئی۔

---

۵۱ راجپوتوں کے قومی شاعر۔

۵۲ جودھپور کا پرانا قصبہ جو میڑتیوں کے نام سے موسوم ہے۔

۵۳ ٹکے میں بکنے سے مطلب یہ ہے کہ قصبہ فتح کر کے بدر بیا ملا کر تمام راٹھوڑیوں کو شہر باہر بلوا لیا گیا جن کی عزت نہیں جاتی تھی بس نام چاہ دھر کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ راٹھوڑ زادیاں ٹکے ٹکے نیلام ہوتی ہیں چلو لینے۔ چنانچہ جو دعورتوں کے (باقی صفحہ ۶۰ پر دیکھئے)

خدا کی پناہ! کیسی روح فرسا اور لرزا دینے والی خبر تھی۔ مارے غصّہ کے میرا منہ لال ہو گیا۔ بھائیوں کی بھری محفل میں میری آگ لگی۔ جوشِ غضب سے دیوانہ ہو کر میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ بیٹے کی قسم کھائی اور فوراً میں نے اور جیجا سنگھ نے اپنے اپنے کھانڈوں کے نیام توڑ ڈالے (کہ اب ہمارے کھانڈے تو کھلے رہیں اور مرہٹوں کے بدن میں رہیں گے) میں نے اپنا کھانڈا مسند پر گاؤ تکیہ سے لگا کر بطور اپنے قائم مقام کے رکھ دیا۔ گلے سے ہار اور سر سے سہرا اُتار کر اپنے کھانڈے[۵۳] کو پہنا دیا اور کہا کہ میں اپنی بہن کی مدد کو جاتا ہوں' میری جگہ یہ میرا کھانڈا ہے۔

(صفحہ ۵۹ سے آگے) رشتہ دار جا کر فی عورت ایک ٹکا داخل کر کے چھڑا لاتے تھے۔ یہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی عورت کو کوئی دوسرا آدمی لے جائے صرف گھر کے مرد اپنی عورتوں کو چھڑا لاتے تھے یہ کارروائی محض توہین کی غرض سے کی جاتی تھی اور اس کا عام رواج تھا۔

۵۳ کھانڈے کے پھیرے سے بیاہ: شادی ہو جاتی ہے پہلے زمانے میں اکثر دولہا اپنی بجائے اپنا کھانڈا دُلہن کے گھر بھیج دیتا تھا اور کھانڈا دولہا کی طرح مسند پر رکھ دیا جاتا تھا اور پالکی میں بھی دولہا کی طرح جاتا تھا اور دُلہن کھانڈے کے ساتھ رخصت ہو جاتی تھی۔ بہت جگہ اب بھی یہی دستور ہے۔

دلہن اس کے ساتھ پھیرے کھائے گی اور اپنے سُسر اور ماں سے میں نے اجازت چاہی۔

قصہ مختصر میں اور رنجیت سنگھ دونوں کے دونوں فوراً کے فوراً اپنی بہنوں کی عزت کا بدلہ لینے کی قسم کھا کر شادی کی محفل سے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

مگر ایک عظیم الشان موت تھی جس نے مجھے گویا چلتے چلتے لمحہ بھر کے لئے روک لیا۔ جنگ پر جا تا ہوں، نہ معلوم لوٹوں یا نہ لوٹوں۔ کم سے کم اپنی بھٹیانی کو تو ایک دفعہ اور دیکھ لوں۔ چنانچہ رنجیت سنگھ کے ذریعہ سے میں نے خفیہ طور پر اپنی اس خواہش کو اپنی ساس چوہانی جی پر ظاہر کر دیا۔ چوہانی جی نے میری التجا منظور کر لی اور نہ بھی کیوں کرتیں۔ اُنہوں نے تو مجھے میرے کھانڈے کی کمائی فوراً کے فوراً ہی سونپ دی تھی۔

آہستہ سے میں کمرے کے دروازے پر پہونچا۔ پردے کو ہاتھ سے ہٹایا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ کمرہ روشنی میں چمک رہا ہے اور ایک خوبصورت سنہری پر بھٹیانی نگینے کی طرح پڑی چمک رہی تھی۔ پردہ اُٹھاتے ہی اُس نے میری طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ سی آئی پھر میرے دل پر ایک بجلی کوند کر

گری۔ ایک وارفتگی کے عالم میں بیتاب ہو کر میں لپکا اور اپنی خوبصورت بھٹیانی کو سچ مچ کلیجہ سے چمٹا لیا اور ......!

خدا کی پناہ عورت، ایک پُرفسوں مگر خاموش اور دلکش راگنی ہے۔ جس کی ہر جنبش ایک دل دوز تان ہے۔ بھٹیانی نے اپنی پوری سحرکارانہ قوت کے ساتھ انتہائی محبت سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا نہیں بلکہ واقعہ یہ تھا کہ تارِ نظر کے ذریعہ مع اپنے ہوش رُبا طاقتوں کے میرے دل میں اتر گئی۔ آہ! میرے دل میں جوشِ محبت سے درد سا ہوتا معلوم دیا، ایسا کہ سچ مچ میرا سانس تیزی سے چلنے لگا اور میں نے درد محبت کی ٹیس سے بیتاب ہو کر آہستہ سے بھٹیانی کو اپنے کلیجہ سے ذرا علیحدہ کیا۔

بھٹیانی نے شرم سے اپنی محبت آمیز نظریں نیچی کرلیں اور میں نے دیکھا کہ عشق و محبت کا نور کس طرح اس کے جبین اور پرفسوں چہرے کی حیا نمائی پر غلطاں ہے۔

بھٹیانی نے پھر اپنے سردار کو ایک نظر دیکھا اور پھر آہستہ سے آنکھیں نیچی کرلیں۔ میں نے مختصر سی باتیں کیں۔ بھٹیانی نے چند الفاظ میں اُن کا جواب دیا۔ ہر جواب محبت کی ایک طولانی داستان تھا۔ یہ واقعہ تھا کہ اگر بھٹیانی نے

اپنے محبّت کے جادو سے دیوانہ کر دیا تھا تو میں نے بھی اُس کے تن بدن میں آگ پھونکدی تھی۔

وقت کم تھا اور ہم دونوں جدا ہوئے۔ میں نے پھر بُڈھیا کو گلے سے لگا لیا اور سچ مچ اُسکو ماہی بے آب کی طرح تڑپتا چھوڑا۔

باہر جو نکلا ہوں تو میری عجیب حالت تھی۔ جنجار سنگھ میرا منتظر ہی تھا۔ ہم دونوں نے فوراً ہی اپنے گھوڑے لیے اور روانہ ہو گئے

جو دروغہ پیغام لایا تھا اُس کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ وہ میٹریوں کا جنگی ڈھول کھاٹو کے کانکڑ کی طرف گرجتا چھوڑ کر آیا ہے لہٰذا ہم دونوں نے بھی کھاٹو کا رُخ کیا۔

جب ہم ہیراوتی کے کانکڑ دخنگل یا میدان پہونچے ہیں تو ہمیں اپنے جنگی ڈھونسے کی پہلی گرج سُنائی دی۔ اس گرج کے سُنتے ہی ہم دونوں کے مُنہ سے بیساختہ اپنا جنگی نعرہ نکلا۔

لے اروانڑ کا ایک گاؤں۔

"زبڑ ہنکارا ٹھوڑ"

دھونسے کی پہلی ہی گرج پر بقول کسے میٹرتیا اپنی دلہن چھوڑ کر دھونسے کی طرف دوڑتا ہے۔

تیسرے ہی دن ہم اپنے لشکر سے کھاٹو سے آگے چلے۔ ہمارا لشکر سیدھا ڈگانے[1] کی طرف جا رہا تھا، جہاں دوسرے روز دشمنوں سے ہماری پہلی ٹکر ہوئی۔

دشمن کے لشکر کو ہم نے چشم زدن میں پاش پاش کر دیا اور اب ہمارا دھونسہ خونی دیو کی طرح گرجتا میٹرتیوں کو چار طرف سے اپنی جنگی آواز کے ساتھ کھینچتا میڑتہ کی طرف لئے جا رہا تھا۔

میڑتہ کے خونی کانکڑ پر ہمارا لشکر مرہٹوں اور کچھواہوں کے جم غفیر سے ٹکرایا۔ اور ڈھائی گھنٹہ کی انتہا سے زیادہ گھمسان اور خوفناک مسلسل جنگ کے بعد ہم نے دشمن کو سخت شکست دی۔ اور کھیرے ککڑی کی طرح کاٹ کر دھر دیا اور خونی میدان پر ہم اور ہمارے بھائی میڑتیے، دشمنوں کے خون میں نہاتے اپنے خونچکاں کھانڈوں کو بلند کئے دشمنوں کے لاشوں کو حقارت سے روندتے

---

[1] جو دھپور ریلوے اسٹیشن بھی ہے۔

تھے۔ اور ہمارا جنگی دھونسہ ایک فتحمند اور خون آشام دیو کی طرح اس خونی میدان جنگ میں گرج رہا تھا۔

(۹)

لڑائی کے بعد ہم دونوں صرف دو روز میٹرتہ میں ٹھہرے۔ اپنی بھتیجی سے ملنے کا شوق اس فتح سے اور بھی زیادہ ہوگیا۔ لہذا جلدی پہونچنے کیلئے ہم نے اپنے گھوڑے یہیں سے چھوڑے اور ایک صبا رفتار رہسا نڈنی کو لے کر ہم دونوں ہوا کی طرح میٹرتہ سے نکل گئے۔

فراق یار میں میرا بُرا حال تھا۔ دن و رات منزلیں مارتے ہم راجلیشور کی طرف اڑے چلے جا رہے تھے ایک ناقابل بیان قوت تھی جو مجھے راجلیشور کی طرف کشاں کشاں بجلی کی تیزی سے لئے جا رہی تھی۔ جب میں سوچان گاہ پہونچا ہوں تو رات کے دو بجے ہوں گے اور ہم نے یہاں تھوڑا آرام لینے کی ٹھہرائی ایک جان پہچان دوست کے یہاں ہم سو گئے۔ اور یہاں میں نے پھر وہی خواب دیکھا:-

"کیا دیکھتا ہوں کہ عجیب نور کا عالم ہے۔ ایک بقعۂ نور سا جنبش میں آتا ہے -

اس میں سے بھٹیانی کا چہرہ اپنی تمام حسن آرائیوں اور جلوہ آرائیوں کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ ایک عشق تاباں ہے کہ حسن لرزاں تبسم و متزلزل! کہ ایکدم چہرے پر ملوتی سنجیدگی آتی ہے۔ جو میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دم سے جلال حسن کی صورت بن جاتی ہے۔ ایک حسن برہم ہے کہ حسن جلالی کا نورانی پیکر۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ میرے منہ سے نکلتا ہے "بھٹیانی" اور اس طلسم سامری کا داہنا ہاتھ اٹھتا ہے۔ کلمہ کی انگلی بلند ہوتی ہے اور ایک دم سے انگلی شمع کافوری کی طرح مشتعل ہو جاتی ہے! خدا کی پناہ! انگلی کی عجیب وغریب نورانی روشنی سے بھٹیانی کا چہرہ ٹمٹما اٹھتا ہے بلکہ بھڑک اٹھتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں: "یہ کیا؟" ایک عجیب انداز سے بھٹیانی جواب دیتی ہے "ارے مرے سوہنا یہ تمہاری ہی محبت کی ابتدا ہے"...... ایک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل جاتی ہے کہ جنجار سنگھ بھی جاگ اٹھا ہم فوراً روانہ ہو گئے۔ پو پھٹ رہی تھی اور ہماری سانڈنی وسیع میدان کی ریت میں ہوائی جہاز کی طرح اڑی چلی جا رہی تھی۔

ہم جلد از جلد راجیلا ریشور پہونچے۔ میں نے اپنے خواب کا حال جنجار سنگھ سے بھی نہیں بیان کیا تھا۔

ہماری سانڈنی ٹھیک میری سسرال کی پھاٹک پر رُکی اور اے میرے عزیز میں تجھ سے اب کیا کہوں کہ ہم نے وہاں کیا دیکھا! جس وقت ہم پہونچے دوپہر کا وقت تھا۔ اور جو کچھ بھی ہم نے وہاں پہونچکر دیکھا یا سُنا وہ بیان سے باہر ہے! گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا اور ہم پہونچے ہیں تو جو بھی وہاں موجود تھا اس پر بجلی گری کیا یہ سب کچھ ممکن تھا؟ مگر ہاں واقعہ تو واقعہ ہی تھا! حیف صد حیف ۔"

یہاں پہونچکر ضعیف العمر سادھو کی آواز بھرا گئی اُس کی خشک آنکھوں میں نمی سی معلوم دی اور وہ رک گیا، اُس نے مجھ سے پانی کا اشارہ کیا۔ سامنے کی دیوار کی طرف اُس نے اشارہ کر کے مجھ سے ایک پتھر ہٹانے کو کہا۔ میں سمجھ گیا میں نے پانی لینے کا کشکول لیا اور پتھر کو یہ سمجھ کر ہٹایا کہ یہاں کوئی گھڑا رکھا ہوگا لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں پتھر کو ہٹایا تو روشنی نمودار ہوئی اور اندر جنگل سا نظر پڑا۔ سامنے کوئی ڈیڑھ فٹ پہاڑی چشمہ تھا جو تیزی سے بہہ رہا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو حیرت و استعجاب کی حد نہ رہی۔ کوئی سو گز کا لمبا چوڑا چھوٹا سا جنگل تھا جو چاروں طرف نہایت ہی بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ نہ صرف اُس کی زمین میں بلکہ ہر چہار طرف دیواروں اور ٹیلوں میں صدہا درخت تھے، جہاں امرود اور شریفہ اور ککروندوں کے درختوں کا جنگل کا جنگل تھا

ں نے جلدی سے چشمہ سے کشکول میں پانی بھرا اور لاکر سادھو کو دیا۔ سادھو نے دعاؤں کے ساتھ پانی لیا۔ ایک دو گھونٹ پی کر پیالہ رکھ دیا پھر اپنا قصہ شروع کیا۔

ہماری میڑتہ کی شاندار فتح کی خبر پہونچ چکی تھی۔ مگر آج ہی ایک دروغہ ورنائی یہ خبر لایا کہ میں لڑائی میں کام آگیا اور نوجوان بھٹیانی بیوہ ہوگئی۔ چنانچہ ں سناؤنی کے آتے ہی نوجوان بھٹیانی نے وہ پگڑی لی جو دروغہ اورنائی یا تھا اور ستی ہونے وہ کب کی مسان پر پہونچی۔ بلکہ کیا عجب ستی ہو بھی چکی۔

یہ خبر سنتے ہی میں سچ مچ پاگل ہوگیا اور ہم دیوانہ وار مسان کی طرف ورے جو شہر سے زیادہ دور نہ تھا۔ ایسے بے تحاشا دوڑے ہیں کہ کبھی دوڑے ہوں گے ابھی لوگ اس طرف جا ہی رہے تھے، کوئی آ نہیں رہا تھا لہٰذا بر ہوئی کہ ہم وقت پر پہونچ جائیں گے۔ یہ خیال کرکے اور بھی حواس باختہ ہوکر وڑے اور چشم زدن میں مسان پر پہونچ گئے۔ ایک جم غفیر تھا اور ہمیں فوراً چیکاروں وجہ سے معلوم ہوگیا کہ بھٹیانی چتا پر چڑھ چکی ہے یعنی چتا میں اس کو بٹھا کر گ لگا دی جا چکی ہے۔ آسمان پر دھوئیں کے مرغولے اس کی تصدیق کر رہے ے۔ لیکن جلنے والی تک آگ ذرا دیر میں پہونچتی ہے۔

توپ کے گولے کی طرح ہم دونوں مجمع چیر کر دھکیلتے ہوئے پہونچے تو کیا دیکھتے
ہیں کہ نور کے سانچے میں ڈھالی اور میری وفادار بیوی بھٹیانی آگ کے بیچوں بیچ
میں بیٹھی ہے اور ہمارے دیکھتے ہی ایکدم سے وہ شعلوں میں لپٹ گئی۔
میں نے بھٹیانی کو دیکھا اور اُس نے مجھکو...... کیسے ہم دونوں کی آنکھیں
چار ہوئیں میں نے غم سے چھاتی پیٹ لی اور سینے سے میرے ایک غم کی چیخ نکلی
کہ کڑا! اور اُدھر بھٹیانی کے محبت بھرے سینے سے ایک دل دوز چیخ نکلی ہے کہ
چھکیلا تیغا! ایک جھناٹا سا ہوا...... اور عالم کائنات کے لٹ کر دو ہو گئے!
بھٹیانی نے تڑپ کر شعلوں سے نکلنے کی کوشش کی..... مگر بیکار اس کا آدھا
جسم جل رہا تھا...... وہیں کی وہیں تڑپ کر میری طرف دیکھتی رہ گئی اور وحشت
اور مصیبت کی شدت سے ایکدم سے اُس کا چہرہ خوفناک اور بھیانک ہو گیا۔
مجھ سے امداد کے لئے اُس نے وحشت زدہ آنکھیں پھاڑ کر اور تڑپ کر ایک اور
دل دوز چیخ لگانا چاہی تھی کہ شعلوں نے اس زور سے اُس کے معصوم اور نازک
رخسار پر آگ کا خوفناک تھپڑ لگائے کہ گال کی چمڑی اُدھڑ کر گر پڑی اور اس کا
بدن وہیں تھرتھرا کر رہ گیا۔ چشم زدن میں آگ کا ایک جہنم تھا کہ جو تیزی سے
بھڑک رہا تھا اور اُس میں کودنے کی میں ناکام کوشش کر رہا تھا۔ میری آنکھیں بند

ہوگئیں اور میں بیہوش ہو کر گرا۔

اس کے بعد میں کتنے دن تک دیوانہ وار گھومتا رہا اور کوئی قوت تھی جو مجھے اس جگہ لائی۔ مجھے ہوش آیا سمت ۱۸۱۵ کی تاریخ ستی جیت بدھپٹ تھی میں ہوش میں تھا اور میں نے آگ کو کوسا اور قسم کھائی

تورا نڈیا نہیں کھاؤں سالیے واس یون ٹہ
ماڈیھاں تو بالیاں بھٹیانی جی روہ

آج پونے دو سو برس ہونے آئے میں نے کوئی آگ کی پکی ہوئی چیز نہیں کھائی مگر آج تک بھٹیانی جی کی محبت کی آگ میں برابر جل رہا ہوں اور جاڑیچی جی اور بھٹیانی جی کی پاک اور مقدس روحیں آج پونے دو سو برس سے سوانہ کی خاموش اور تاریک گپھاؤں میں گھومتی رہتی ہیں۔ اور جب رات آتی ہے تو میرے سامنے دونوں کی دونوں اپنی اپنی چتاؤں پر بیٹھ کر آجاتی ہیں اور یہ خوفناک ڈرامہ برابر جب سے روزانہ رات کو میرے سامنے ہوتا آ رہا ہے۔

لے اے بے غیرت، اسد یو نیچا آگ میں اب کبھی تیرا پکایا ہوا نہیں کھاؤں گا (غضب کہ)
تو نے میرے دیکھتے دیکھتے بھٹیانی جی کی ہڈیاں جلا دیں۔

اور یہی راز ہے میری اس مُردہ زندگی کی طوالت کا۔ مگر اب میرے گناہوں کی شاید تلافی ہو چکی۔ اے میرے اجنبی عزیز وہ مٹی اور وہ لاشہ میں ہی ہوں مجھے جلا نا مت اور جس چشمہ سے پانی لائے ہو اسی میں مجھے لٹا دینا۔.......

جے ہو شری جا ڑ بیجی جی کی
جے ہو شری بھٹیانی جی کی

خدا حافظ

سادھو کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور وہ مُردہ تھا۔ میں نے جلدی سے سادھو کی وصیت کی تکمیل کی اور جس قدر جلد ہو سکا غار سے نکل کر نیچے پہونچا۔

سورج ڈوب رہا تھا اور میں نے مُڑ کر دیکھا کیا دیکھتا ہوں کہ وہی سفید بلی میری طرف دیکھ رہی ہے۔ میں نے قدم تیز کئے اور جراغ جلے اپنی جائے قیام پر تھا

(۱۰)

اب جس سے کہتا ہوں وہ یہی کہتا ہے کہ بھول کر بھی کبھی سوانہ کی گپھاؤں کی طرف نہ جانا اور نہ ابکی زندہ لوٹنا مشکل ہے۔ کوئی کہتا ہے مقامی

تخییل تھا اور کوئی کہتا ہے کہ ضرور تم نے کوئی خواب دیکھا ہے اور میں کہتا ہوں کہ واقعہ اور خواب میں فرق ہے اور جہاں تک میں غور کرتا ہوں یہ خواب نہیں تھا۔ واللہ اعلم ۔

ختم شد

پرنٹر و پبلیشر
محمد حبیب الدین ایف۔ آر۔ ایس۔ اے لندن
مطبوعہ نظامی پریس بدایوں۔